مضامین جمال الدین افغانی رح

بترجمہ

محمد عبدالقدوس قاسمی

ادارہ فروغِ اردو لاہور

بار دوم

قیمت :- چار روپے

محمد طفیل مالک ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے اردو پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی۔

فہرست

میں اپنی اس سعیٔ بے مایہ کو

ہندوستان میں تحریک اتحاد اسلامی کے آخری داعی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

منسوب کرتا ہوں

کہ ذرہ خوش بود ش نسبتے بہ خورشیدے

محمد عبدالقدوس قاسمی

"انیسویں صدی کی تاریخِ مشرق نے اصلاح و تجدّد کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں ان میں کوئی شخصیت بھی وقت کی عام پیداوار سے اس قدر مختلف اور اپنی طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوّتوں میں غیر معمولی نہیں ہے جس قدر سیّد جمال الدّین کی شخصیت ہے۔ بغیر کسی تامّل کے کہا جا سکتا ہے کہ مشرقِ جدید کے رجالِ تاریخ اور قائدینِ فکر کی صف میں اس کی شخصیت کوئی اعتبار سے اپنا سہیم و شریک نہیں رکھتی۔

مذہب اور علم دونوں میں اس کی مُصلحانہ ذہنیت نمایاں ہوتی ہے اور کسی گوشہ میں بھی اس کے قدم وقت کی مقلدانہ سطح سے مس نہیں ہوتے۔ سیاست میں وہ سرتاپا انقلاب کی دعوت دیتا ہے اور جہاں کہیں جاتا ہے، چند دنوں کے اندر مستعد اور صالح طبیعتیں چن کر انقلاب و تجدّد کی رُوح پھونک دیتا ہے۔ اس نے بیک وقت مصر، ایران اور عراق تینوں مقامات میں اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی کر دی۔"

ابوالکلام آزاد

جمال الدین افغانی

گفت مشرق زیں دو کس بہتر نزاد
ناخنِ شاں عقدہ ہائے ما کشاد

سیّد السادات مولانا جمال
زندہ از گفتارِ او سنگ و سفال

ترک سالار آں حکیمِ دردمند
فکرِ او مثلِ مقامِ او بلند

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنّت است

(جاوید نامہ)

(علامہ اقبال)

پیش لفظ

اسلامی ممالک کی کس مپرسی اور ناتوانی جتنی آج نمایاں ہے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے اتنی نہ تھی۔ اس وقت افغانستان، ایران اور سب سے زیادہ خلافت عثمانیہ کا "مردِ بیمار" اپنے بوسیدہ نظام کے باوجود خود مختار شہنشاہیتوں کے لباس میں جلوہ گر تھا۔ مسلمان اپنے شاندار ماضی کی ان یادگاروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور حکومت و سلطنت کے نشہ میں مست اپنے گردوپیش کے انقلابات سے بالکل بے نیاز تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان "متبرک آثارِ قدیمہ" کی ظاہری شان و شوکت کتنی ہی بارعب اور پُرجلال کیوں نہ ہو ان کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی ہیں۔ زمانے کی رفتار اور حوادث کی کثرت نے ان کی عمارت کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور اب اس کی مرمت کے لئے بے پناہ اور اَن تھک جدوجہد کی ضرورت ہے۔

یورپ کی مکار اور حریص حکومتیں ان شکاریوں کو ہڑپ کرنے کی تاک میں لگی ہوئی تھیں۔ ان کو آگے بڑھنے اور حملہ کرنے سے کوئی چیز روک رہی تھی تو وہ اسلامی ممالک کی طاقت نہیں بلکہ خود اِن حکومتوں کا باہمی اختلاف اور خود غرضی تھی۔ اگر یہ حکومتیں آپس میں فیصلہ کرکے متفق ہوسکتیں تو اسلامی حکومتوں کا سلسلہ آج سے مدّتوں پہلے ناپید ہوچکا ہوتا۔

ہندوستان کی تیموری سلطنت اس بارے میں دنیا کے لئے عبرت کا نمونہ پیش کر چکی تھی۔ جب تک فرانسیسی اور انگریزی حکومتیں یہاں باہم برسرِ پیکار رہیں ہندوستان پر کسی ایک حکومت کو تیزی سے قبضہ کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر جونہی آپس کا مقابلہ ختم ہوا اور انگریزوں کے لئے میدان خالی رہ گیا تو سارے ملک پر قبضہ کرنا ان کے لئے چند سال کی بات رہ گئی۔ ساری ریاستیں یکے بعد دیگرے قبضہ میں لے لی گئیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی نے تو ہندوستانی مسلمانوں کا رہا سہا حوصلہ بھی پست کر دیا۔ ہندوستان کے بعد تقریباً اسی قسم کے واقعات مصر میں پیش آنے لگے حکمرانوں کو معزول یا بحال کرنے کے معاملے میں دخل دے کر اور دو فریقوں کے درمیان ثالث بن کر ممالکِ عربیہ پر قبضہ کرنے اور زمامِ سلطنت کو ہاتھ میں لینے کی سیاست عمل میں لائی جانے لگی۔

مرض کے علاج کی فکر اسی کو زیادہ ہوتی ہے جو اُس کی تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ اجنبی تسلط کی اِس بلائے بے درماں سے نجات حاصل کرنے کا خیال بھی اوّل اوّل مصر و ہند ہی کے چند اربابِ ہمّت کے دِل میں پیدا ہوا۔ اس گرداب سے بچ نکلنے کے لئے ان کی کوششیں تیز ہو گئیں اور اپنی کامیابی کے متعلق شک ولیقین اور اضطراب و اطمینان کے ملے جلے جذبات رکھنے کے باوجود انہوں نے اپنے مقاصد کی طرف قدم بڑھانے کے لئے کئی جماعتیں قائم کیں۔ ان میں سب سے زیادہ کامیاب سید جمال الدین افغانی رح اور ان کے رفقاء کی قائم کردہ

جماعت "جمعیتہ العروۃ الوثقیٰ" تھی۔ اور ان کی کوششوں کا بہترین نمونہ رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" تھا جو ۱۸۸۴ء میں عربی زبان میں پیرس سے جاری کیا گیا۔

رسالہ کے پہلے شمارے میں ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیّد صاحب فرماتے ہیں:-

"عام طور پر مشرقی قوموں کی بربادی کی اب کوئی حد نہیں رہی۔ وہ بے حد تباہ حال ہو چکی ہیں۔ خصوصاً مسلمان جن کے بہت سے تاجدار اپنے تاج و تخت اور حکومت کے حقدار اپنے حقوق سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ بیشمار اصحاب جاہ و عزّت کو ذلیل کیا گیا۔ لاتعداد صاحب ثروت فقیر ہو گئے۔ کل تک کے صحیح و تندرست آج مریض نظر آتے ہیں اور کوئی فرقہ، طبقہ اور گروہ ایسا نہیں جو اس عام تباہی و بربادی سے محفوظ رہ گیا ہو۔

اِن آخری ایام میں مشرقی ممالک کے اہم مقامات میں یکساں مصیبتیں نازل ہوئی ہیں۔ اِن کی وجہ سے اِن کے تمام باشندوں میں باہمی ربط و اتّحاد کی تجدید ہو گئی ہے۔ ہر جگہ ارباب فہم بیدار ہو چکے ہیں اور موجودہ حالات کے نتائج پر غور کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ربط و اتّحاد اور سعی و کوشش کی بنا پر اس کے امیدوار ہیں کہ شاید کھوئی ہوئی شوکت و قوّت کو ایک دفعہ پھر پالیں اور موجودہ حوادث میں ان کو اپنے دین و مذہب، شرف و وقار اور ننگ و ناموس کی حفاظت و صیانت کا کوئی موقعہ ہاتھ آئے۔ وہ موجودہ وقت کو ایک مغتنم فرصت سمجھتے

ہیں اور اس سے ان کی اُمیدیں قائم ہیں۔ لیکن فرض کرو کہ یہ موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہے تو پردۂ غیب سے اس قسم کے بیسیوں مواقع آئندہ اور پیدا ہو جائیں گے"

اِس ماحول کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جریدۂ العروۃ الوثقیٰ کے مقاصد کو اِس طرح بیان کیا گیا ہے :-

"یہ جریدہ بقدرِ امکان مشرقی قوموں کے سامنے اُن ضروری کاموں کی تفصیلات بیان کرے گا۔ جن میں کسی طرح بھی کمی کرنا بربادی، کمزوری اور تباہی کا سبب ہے۔ اور ان راستوں کی طرف رہنمائی کرے گا، جن پر چلنا تلافیٔ مافات کے لئے از بس ضروری ہے"!

"یہ جریدہ مشرق کے اعلیٰ طبقہ کی نگاہوں سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کریگا اور اِن شُبہات کو دُور کریگا۔ جن کی وجہ سے ہدایت اور کامیابی کا راستہ اُن کی نظروں سے چھُپ گیا ہے اور وہ عام طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مصیبت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور تدارک و تلافی کا زمانہ گزر چکا۔ یہ جریدہ اس غلط خیال کو مٹائے گا۔ کہ مسلمان اپنے اسلاف کے قائم کردہ اُصولِ کامیابی پر کاربند رہ کر کامیابی نہیں حاصل کر سکتے"

دُنیا کی سیاسیات کا جو اثر مشرقی اقوام پر پڑ سکتا ہے اور اہلِ سیاست مشرق کے بارے میں خصوصاً جن مسائل کو ہاتھ میں لیں گے یہ جریدہ اِن دونوں قسم کے مسائل سے اہلِ مشرق کو خبردار رکھے گا اور صحیح سیاست کی طرف رہنمائی

کرے گا۔"

"اس کے علاوہ جریدہ ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھے گا کہ اقوام عالم کے باہمی تعلقات مضبوط رہیں ان کے افراد میں اُلفت قائم رہے مشترک منافع کی تائید ہوتی رہے اور سیاسیات میں وہ صحیح راستہ اختیار کر لیا جائے جو ظلم اور اہل مشرق کے حقوق غصب کرنے پر منتج نہ ہو۔"

جریدہ "العروۃ الوثقٰی" کے صرف اٹھارہ شمارے نکل سکے۔ اس کے بعد یہ جریدہ مختلف تدبیروں سے بند کرا دیا گیا۔ مگر ان اٹھارہ شماروں نے دنیائے مشرق میں ایک ہلچل مچا دی اور اس کے مضامین اکثر اخباروں میں ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگے۔ سید جمال الدین افغانی کی دُور بین نگاہوں نے مشرق کے امراض کی صحیح تشخیص کی تھی اور جریدۂ العروۃ الوثقٰی کے مضامین میں اس کا مفصل علاج تجویز کیا گیا تھا۔ اسی وجہ سے اہل نظر بعد کے زمانوں میں بھی اِن مضامین کی قدر و قیمت کو خوب پہچانتے رہے۔ چنانچہ جریدہ کے تمام شماروں کو یکجا کر کے دو دفعہ مصر سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

ان مضامین میں تمام دنیائے اسلام کے حالات پر تبصرہ کیا جاتا تھا۔ اور مسلمانوں کے قومی امراض کا علاج خواہ وہ کسی خطّے سے تعلق رکھتے ہوں تجویز کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان میں بیشتر مضامین ایسے بھی تھے جن میں جا بجا ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کے متعلق حوالے دیئے گئے تھے اور جن کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کو

جو زندگی کے موڑ پر کھڑے ہوئے تھے انہیں اپنے مذہب اور قومیت کے تحفظ کے متعلق راہ عمل اختیار کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔

اُردو میں سیّد صاحب پر اس سے پہلے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں آثار جمال الدین اور مقالات جمال الدین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آثار جمال الدین سیّد صاحب کے سوانح حیات پر مشتمل ہے اور عالمانہ تحقیقی معیار کی حامل۔ مقالات جمال الدین، سیّد صاحب کے فارسی مقالات کا ترجمہ ہے۔ لیکن ہماری زبان کا دامن ان نایاب موتیوں سے ابھی تک خالی تھا جو عروۃ الوثقیٰ کے صفحات پر اس وقت بکھرے جب ان کا زورِ قلم دورِ شباب پر تھا اور جب انہوں نے اپنے افکار کی پختگی کے بعد دنیا کو اپنا پیغام دینا چاہا تھا۔ ان مضامین میں ہنگامی جوش و خروش بھی تھا اور دائمی زندگی اور استواری بھی۔

اُردو کی تہی دامانی کے خیال نے مجھے سیّد صاحب کے عربی مضامین کا ترجمہ پیش کرنے پر آمادہ کیا۔ زیر نظر کتاب سیّد صاحب کے ان گراں قدر مقالات کے ترجمہ پر مشتمل ہے جو زندگی اور استواری کے حامل تھے۔ یہ عروۃ الوثقیٰ کے فائلوں کے انتخاب ہیں اور سیّد صاحب کی صحافت اور عربی نویسی کا اعلیٰ نمونہ۔

کتاب کے شروع میں سیّد صاحب کے سوانح حیات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن سے ان کی شخصیت اپنی تمام عظمتوں کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ کسی عظیم تخلیق کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے خالق کے حالات زندگی کے متعلق قاری کو

جو تجسس پیدا ہوتا ہے یہ حصہ اس کی تشفی کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔
اپنی ذاتی رائے اور تنقید کو محفوظ رکھتے ہوئے یہ مجموعہ نذر قارئین ہے۔

محمد عبد القدوس قاسمی

مختصر حالاتِ زندگی :-

پیدائش ۔ جلال آباد (افغانستان) ۱۸۳۹ء

۱۸۶۹ء تک امیر دوست محمد خاں اور امیر شیر علی خان کے مشیر رہے۔

اس اثنا میں دو دفعہ ہندوستان اور حجاز کی سیر بھی کی۔

۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۹ء تک کا عرصہ کچھ ترکی اور اکثر مصر میں گزارا، مصر کی موجودہ بیداری میں ان کے ان ایام کا خاص حصہ ہے۔

۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۲ء تک ہندوستان میں رہے۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک یورپ میں رہے اور اسی دوران میں عروۃ الوثقٰی جاری کیا۔

۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۲ء تک روس، ایران اور لندن میں رہے ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۷ء تک ترکیہ میں مقیم رہے۔

وفات ۔ قسطنطنیہ ۹ مارچ ۱۸۹۷ء

مزار ۔ کابل ۱۹۴۵ء

سیّد جمال الدین افغانی

حالات زندگی

حسب و نسب سیّد جمال الدین افغانی شعبان ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے ایک گاؤں کونڑ میں پیدا ہوئے جو جلال آباد کے گرد و نواح میں آباد ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب سرحدی و افغانی سادات کے مورثِ اعلیٰ سیّد علی ترمذی سے ملتا ہے[1]

سیّد علی ترمذی دسویں صدی ہجری کی ابتداء میں افغانستان تشریف لائے تھے ان کے حالات ان کے ایک ارادت مند اور صوبۂ سرحد کے مشہور عالم اخوند درویزہ صاحب نے اپنی کتاب تذکرۃ الابرار میں بالتفصیل لکھے ہیں۔ سیّد علی ترمذی مقامی طور پر پیر بابا کے نام سے مشہور ہیں ان کا مزار علاقہ بنیر میں ہے جو مردان کے

---

[1] سیّد جمال الدین افغانی، بن سیّد صفدر، بن سیّد علی، بن سیّد رضی الدین، بن سیّد زین العابدین، بن سیّد ظہیر الدین، بن سیّد جمال الدین عرف سیّد جمال، بن سیّد مصطفیٰ بن سیّد عبدالوہاب، بن سیّد مصطفےٰ بن سیّد علی ترمذی۔

شمال مشرق میں ریاست سوات کا ایک حصہ ہے۔ لے

ابتدائی تعلیم سیّد جمال الدین افغانیؒ کے والد سیّد صفدر مرحوم اپنے علاقے میں کافی اثر و رسوخ کے مالک تھے اور صاحب ذوق عالم بھی تھے، اور اپنی زندگی میں ہندوستان کی درسگاہوں اور ان کی ترقیات کا مطالعہ کرنے کے خیال سے برصغیر کا سفر بھی کر چکے تھے۔ افغانیؒ نے اپنی عمر کے ابتدائی سات سال انہی کے سایۂ تربیت میں گزارے۔ ان کے اس دور کے اساتذہ میں سادات کونڑ کے مشہور عالم سیّد فقیر بادشاہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۲۶۳ھ میں امیر دوست محمد خاں نے سیّد صفدر مرحوم کو کابل بلایا اور ان کی جائداد و املاک کو سرکاری قبضے میں لے لیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ سیّد صفدر کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ تھا۔ جس سے امیر دوست محمد خاں کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے حریف بنتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ سیّد صفدر اور ان کے اہل و عیال سنہ ۱۲۷۱ھ تک کابل میں نظر بند رہے۔ اسی دوران میں سیّد جمال الدین افغانی نے مختلف علومِ حکمت، ریاضی، نجوم اور تاریخ وغیرہ حاصل کئے۔ تقریباً نو سال کے بعد نظر بندی کی صعوبت ختم ہوئی اور ان

لے بعض لوگوں نے سیّد علی ترمذی کو جامع ترمذی کا مصنف بتایا ہے۔ یہ ایک فاش غلطی ہے اس کی طرف آثار جمال الدین کے مصنف نے بھی توجہ دلائی ہے۔

لوگوں کو کابل سے اپنے وطنِ اصلی کو جانے کی اجازت ملی۔ لیکن یہاں سید صفدر کی حیات، وقت کا زیادہ ساتھ نہ دے سکی اور سید جمال الدینؒ پر اب اپنی تمام ذمہ داریاں آپڑیں۔

سفرِ ہندوستان

اس وقت افغانیؒ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ چنانچہ والد کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد وہ پہلی بار ہندوستان آئے۔ ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس کرنا تو مشکل ہے کہ وہ کسی بڑے انقلابی پروگرام کے ارادے سے یہاں پہنچے تھے۔ البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ تکمیلِ علوم اور ہندوستان کی علمی ترقیوں کے مستفید ہونے کی غرض سے انہوں نے یہ سفر اختیار کیا تھا، کیونکہ اس وقت ہندوستان کی علمی مرکزیت افغانستان میں تسلیم کی جاچکی تھی۔ دِلّی کالج اور دوسرے نئے اداروں کا دور شروع ہوچکا تھا۔ اور جدّت پسند طبیعتیں ان میں نئے علوم وفنون کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی تھیں۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ یہاں کی ترقیات کا شہرہ سن کر سید صاحب کا علمی تجسس بڑھا ہو اور اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، انہوں نے خالص علمی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے یہ سفر کیا ہو۔ اعمی کا یہ بیان کہ ضمناً ریاضی جدیدو پارہ علوم تازہ بہ آن خاک قدم گزاشتہ بود آں را تحصیل کرد"۔ صحت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ ان دنوں انقلاب ہند یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ابھی ایک سال کا عرصہ باقی تھا۔ اندر ہی اندر مواد پک رہا تھا اور اس کے آثار ظاہر ہونے ہی والے

تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ افغانی یہاں رہ کر اس انقلاب کے حالات سے بے خبر رہے ہوں۔ لیکن قدرت کو چونکہ انہیں عالمِ اسلام کا نقیب اور جنگِ اتحادِ ممالکِ اسلامیہ کا ہیرو بنانا تھا، اس لئے وہ اس آگ میں کودنے سے بچ گئے اور ۱۸۵۷ء کے آغاز ہی میں حجاز روانہ ہو گئے۔ فریضۂ حج ادا کیا اور شام عراق عرب وغیرہ ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے ۱۲۷۴ھ میں افغانستان واپس پہنچ گئے۔

دربارِ افغانستان میں اثر و رسوخ

یہاں امیر دوست محمد نے انہیں اپنی مصاحبت میں رکھ لیا۔ اور اپنے صاحبزادہ محمد اعظم خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۲۷۹ھ میں انگریزوں نے امیر دوست محمد خاں کو ترغیب دی۔ کہ وہ ہرات پر قبضہ کر لے۔ امیر نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے، ہرات پر حملہ کر دیا۔ ہرات میں اس وقت امیر کے بھائی سلطان احمد خاں شاہ ایران کی طرف سے گورنر مقرر تھے۔ دونوں بھائیوں میں مقابلہ ہوا۔ اور کسی بڑی خونریزی کے بغیر امیر دوست محمد خاں قلعہ ہرات پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہا جاتا ہے کہ اس کامیابی میں سیّد جمال الدّین افغانی کی کوششوں اور تدبر دانی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

اسی سال امیر دوست محمد اور اس کا بھائی سلطان احمد خاں فوت ہو گئے اور دوست محمد خاں کی وصیّت کے مطابق اس کا چھوٹا لڑکا امیر شیر علی تخت و تاج

کا وارث قرار پایا۔ بڑے بھائیوں کے ہوتے ہوئے۔ سب سے چھوٹے بھائی کا گدی پر بیٹھنا قدرتاً آپس کے اختلاف اور اندرونی خلفشار کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ بھائیوں بھائیوں میں عداوت کی گرہ پڑ گئی مگر یہاں بھی جمال الدین افغانی کا وجود ایک سایۂ رحمت بنا رہا۔ ان کا اثر سب بھائیوں پر یکساں تھا۔ خصوصاً صاحبزادہ اعظم خاں ان کا بحیثیت استاد کے بڑا احترام کرتا تھا۔ ان کے سمجھانے بجھانے سے بڑے بھائی، شیر علی کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ اور تباہی و خونریزی کا طوفان ٹل گیا۔ امیر شیر علی نے افغانی رح کو مشیر و مصاحب کے طور پر دربار میں رکھا۔ اور ان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اپنے چالاک وزیر محمد رفیق کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا۔ رسماً وہ افغانی رح سے صلاح مشورہ ضرور کرتا تھا لیکن عملاً وہی راہ اختیار کرتا جو محمد رفیق اُسے سُجھاتا تھا۔ محمد رفیق کی نیّت یہ تھی کہ بھائیوں میں پھوٹ ڈلوا کر اپنی ترقّی اور اہمیّت کے لئے میدان ہموار کرے۔ چنانچہ اس نے شیر علی کو مشورہ دیا کہ اس کے بھائی تاج و تخت کی وراثت کے معاملے میں اُس کے حریف ہیں اور کسی وقت بھی سر اُٹھا کر اس کے لئے خطرہ پیدا کر سکتے ہیں اس لئے سب سے پہلے انہیں درمیان سے ہٹانا چاہیئے۔ اس نے شیر علی کو سمجھایا کہ بھائیوں کو گرفتار کر کے قید میں ڈلوا دے۔ افغانی نے اُسے اس حرکت سے باز رہنے کا ہر چند مشورہ دیا لیکن اس نے ایک نہ سُنی اور محمد رفیق کی رائے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب

ہوتا، بھائیوں کو سارے منصوبے کی اطلاع مل گئی اور انہوں نے اپنے بچاؤ کی تدابیر اختیار کر لیں - ادھر افغانی کو بھی اب یہ بخوبی معلوم ہو گیا کہ شیر علی رسماً ان کی تعظیم و تکریم کرتا ہے مگر عملاً محمد رفیق کے ہاتھوں میں کھیلتا ہے، اس لئے انہوں نے بھی اپنا آشیانہ تبدیل کرنے کی ٹھان لی اور دربار سے وقتی سفر کی اجازت لے کر ۱۲۸۰ھ میں ہندوستان چلے آئے.

اس سفر سے ان کا مقصد چند دنوں کے لئے افغانستان کی اندرونی کشمکش سے یکسوئی اختیار کرنا تھا وہ ہندوستان کی داخلی یا خارجی سیاست میں دخل دینے کی غرض سے نہیں آئے تھے. لیکن کہا جاتا ہے کہ حکومت ہند نے انہیں پنجاب سے آگے بڑھنے نہ دیا. شاید اس لئے کہ انگریز دربار افغانستان کے خلفشار میں شیر علی کے سر پہ ہاتھ رکھنا چاہتے تھے - اور افغانی شیر علی کے مخالف تھے. لیکن یہ پتہ نہیں چل سکا. کہ اس قیام کے دوران میں وہ کہاں کہاں اور کتنی مدت تک رہے - اس اثنا میں شیر علی اپنے بھائیوں کو زک دینے کی تدابیر کرتا رہا. چنانچہ محمد اعظم تو مقابلہ کی تاب نہ لا کر ہندوستان آگیا، دوسرا بھائی سردار افضل خاں قید ہوا اور تیسرا بھائی محمد امین خاں قندھار میں مارا گیا.

اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا. محمد اعظم نے عبدالرحمٰن کے ساتھ مل کر شیر علی کو ہرات کی طرف بھگا دیا - محمد رفیق کو پھانسی دے دی اور افضل خاں کو رہائی دلائی - افغانی بھی اس وقت ہندوستان سے افغانستان پہنچ گئے

اور محمد اعظم کی تائید و سرپرستی میں مصروف رہے۔ ڈیڑھ سال تک وہ اس کے مشیر خاص اور وزیر اعظم بنے رہے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن خاں اور محمد اعظم خاں میں چپقلش ہوگئی۔ شیر علی نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ ادھر انگریزوں کی للچائی ہوئی نظریں افغانستان پر پڑ رہی تھیں اور وہ وہاں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتے تھے چنانچہ انگریزوں نے شیر علی کی حمایت کی اور شیر علی اعظم خاں کے مقابلے میں آکھڑا ہوا محمد اعظم میں ایک خرابی یہ تھی کہ اپنے ارکان دولت سے درشتی اور سختی کا برتاؤ کرتا تھا۔ چنانچہ جب یہ موقع آیا تو وہ سب کے سب اس سے کٹ گئے اور شیر علی سے جا ملے اعظم خاں اور عبدالرحمٰن خاں دونوں کو شیر علی کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ اور شیر علی پھر تاج و تخت پر قابض ہوگیا۔

ترکِ وطن

افغانیؒ اس وقت کابل ہی میں موجود تھے۔ محمد اعظم کے حامی اور مشیر خاص ہونے کی وجہ سے شیر علی ان کو چاہتا تو نہ ہوگا، لیکن اسے شیر علی کی شرافت اور قدر دانی سمجھئے یا افغانیؒ کی شخصیت اور عزیمت کا اثر کہ شیر علی نے ان سے کوئی تعرض نہ کیا مگر واقعات نے جو صورت اختیار کی تھی، اس کے پیش نظر سیّد صاحب کی غیرت مند طبیعت نے افغانستان میں مزید رہنا گوارا نہ کیا۔ اور ۱۸۶۹ء میں انہوں نے اپنے وطن کو خیر باد کہہ دیا۔

مصر و ہند میں مختصر قیام

وطن سے نکل کر سیّد صاحب سیدھے ہندوستان آئے۔ اور ایک مہینہ یہاں مقیم رہے۔ مگر حکومت ہند نے انہیں یہاں

کے علماء سے ملنے کا موقع نہ دیا۔ علماء پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ افغانی سے کوئی ملاقات نہ کریں۔ ان حالات میں کون شخص رہنا گوارا کر سکتا ہے۔ چنانچہ افغانی یہاں سے چل کھڑے ہوئے اور مصر پہنچے۔ اب تک ان کی شہرت کو افغانستان کے ایک مدبر اور سیاس کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا۔ اور مہینوں ہندوستان و افغانستان کی سیاحت کرنے اور علمی طبقوں سے روشناس ہونے کے باوجود ایک ممتاز عالم کی حیثیت سے انہیں لوگ زیادہ نہیں جانتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے دورانِ قیام میں حکومتِ ہند کے علما کو ان سے ملاقات کرنے کی اجازت نہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ طبقۂ علماء میں ان کے لئے کافی انس و محبت کے جذبات موجود تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ انس و محبت خالصتہً ان کی سیاست دانی کی بنا پر ہو لیکن مصر کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ان سے لوگوں کو جو عقیدت اور محبت پیدا ہوئی وہ ان کے سیاسی نظریات کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے سرمایۂ علمی کی بنا پر تھی۔ یہاں سب سے پہلے مصر کے ذہین طلبہ کی ایک جماعت نے ان کی علمیت کا اعتراف کیا۔ پھر رفتہ رفتہ تمام علمائے مصر نے ان کے اس وصف کو مان لیا۔ یہاں انہوں نے چند شامی طلبا کی درخواست پر شرح اظہار کا درس دینا شروع کیا۔ جس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں علمی گفتگو کم اور سیاسی زیادہ ہوتی تھی۔ انگریزی سیاست پر تنقید اس درس کا جزو اعظم ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ میں سیاسی شعور اُبھرنے لگا۔ اور وہ اپنے ملک میں اغیار کی ریشہ دوانیوں کو کچھ کچھ سمجھنے لگے۔ یہ باتیں برطانوی سیاست

کے لئے کب قابلِ برداشت تھیں۔ چنانچہ ایک اتفاقی واقعہ کو بہانہ بنا کر حکومت مصر سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ افغانیؒ کو مصر سے نکال دے۔ اگرچہ عام مسلمانوں اور طبقۂ علما و طلبہ کے لئے یہ مطالبہ بڑے رنج والم اور غیظ و غضب کا باعث تھا لیکن خدیو مصر جو انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہؤا تھا خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ افغانیؒ مصر میں رہتے ہوئے اس کی سیاست کا پردہ چاک کریں۔ بہت لوگوں نے کوشش کی کہ افغانی کو مصر سے جانے نہ دیا جائے لیکن خدیو نے معذرت کا اظہار کر دیا اور افغانیؒ چالیس روز کے مختصر قیام کے بعد مصر سے قسطنطنیہ روانہ ہو گئے۔

محمد عبدہٗ

مصر میں اس مختصر قیام کے دوران میں انہیں وہ مخلص شاگرد اور رفیق کار ملا جس نے آگے چل کر ان کے نصب العین اور شہرت کے آفتاب کو نصف النہار پر پہنچایا۔ اور وہ تھا شیخ محمد عبدہٗ مصریؒ جس کا نام افغانیؒ کے نام کے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس وقت محمد عبدہٗ کی عمر صرف بیس سال تھی۔

قسطنطنیہ میں

جس زمانے میں افغانیؒ قسطنطنیہ پہنچے وہ دولتِ عثمانیہ کے لئے بہت پُر آشوب تھا۔ مغربی سیاست بھوکے بھیڑیئے کی طرح عثمانی قلمرو کے ایک ایک عضو کو الگ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ خود عثمانی سلاطین کی حکمتِ عملی سے عوام مطمئن نہ تھے، ہر طرف ایک بے چینی اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ اِن حالات میں افغانی نے ترکیہ پہنچ کر اپنے مقصد کا

اعلان کیا تو ہر طرف سے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے بہت جلد عوام کی حمایت حاصل کر لی اور اپنی فضیلت اور زورِ بیان کے اثر سے وزیر اعظم کی نگاہ میں بھی بہت وقیع بن گئے۔ وزیر اعظم نے انہیں امور معارف کی اصلاح کی غرض سے انجمن معارف میں شریک کر لیا۔

یہ ذمہ داری سنبھال کر افغانی رحمہ نے ترکیہ کے نظام تعلیم میں بیش بہا اصلاحات کیں۔ اور مختلف موضوعات پر لکچر بھی دینے شروع کیے۔ یہ لکچر اتنے مقبول ہوئے کہ ترکی میں افغانی کا نام "سحر القلوب" مشہور ہو گیا تھا۔ دینی اور اجتماعی موضوعات پر وہ جامعہ کبیر اور مسجد ابا صوفیا میں وعظ و تبلیغ بھی کرتے تھے۔ اس طرح عوام سے ان کا تعلق براہِ راست قائم ہو گیا اور اُن کی شہرت نہ صرف سارے مرکزِ خلافت میں بلکہ شام، عراق اور حجاز تک پھیل گئی۔

علمائے ترکیہ کی مخالفت

جب قدرت کسی کو عروج و اقبال کی دولت عطا کرتی ہے تو حاسد بھی اتنے ہی پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھول کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ افغانی رح کا اثر و رسوخ اور اقبال دیکھ کر ترکی کے قدامت پرست علما ان سے جلنے لگے۔ ان کا فلسفۂ اسلام جس کی بنیاد وسعتِ خیال۔ بلندی عزائم۔ آزادیٔ فکر، صحیح اور آبرومندانہ قومی نصب العین اور وقت کے نئے تقاضوں اور بدلتی ہوئی قدروں کے ریلے میں ملّی وقار کے تحفظ و بقا کی بنیادوں پر تھی۔ قدامت پرست علما یا بالفاظ دیگر تنگ نظر

ملّاؤں کے مفاد کے خلاف تھا کیونکہ اس سے ان کے جھوٹے اقتدار کا بت پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ سید صاحب اپنی تقریروں میں جن خیالات کا اظہار کرتے تھے، وہ شیخ الاسلام اور اس کے حواریوں کی نظر میں بدعت قرار پائے۔ اور چاروں طرف سے ان پر بے دینی اور کفر کے فتووں کی بوچھار ہونے لگی۔ ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح افغانی رح کے وقار کو عوام اور حکومت کی نظر میں گرا کر ان کو اپنے منصب سے ہٹا دیا جائے۔ لیکن افغانی مرد مجاہد تھے۔ ان کی رگوں میں بزدلی کی بدبدت نہ تھی کہ میدان چھوڑ کر بیٹھ رہتے۔ ان کی تو نس نس میں خود اعتمادی، جرأت اولوالعزمی اور خلوص کی بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور ان کی بے لاگ تنقید، حقیقت پسندی اور جد وجہد میں سختی کے ساتھ تلخی اور انتہا پسندی بھی آ گئی۔ اور ان کی روش کا یہی وہ بنیادی مزاج تھا جس کی وجہ سے انہیں ترکیہ سے بھی نکلنا پڑا۔ یہاں اس واقعہ کی ضروری تفصیل بے جا نہ ہو گی جو ان کے ترکیہ سے اخراج پر منتج ہوا۔

جامعہ قسطنطنیہ کے صدر خواجہ تحسین آفندی کے اصرار پر افغانی رح نے دار الفنون مسجد فاتح سلطان محمد میں ایک تقریر ترکی زبان میں کی۔ جس میں انہوں نے انسانی اجتماع کو ایک زندہ جسم سے تشبیہہ دے کر ہر علم وفن کو خاص خاص عنصر کا درجہ دیا۔ اور انہی میں نبوّت اور حکمت کو بھی شمار کیا۔ اپنے مقصد کی پوری وضاحت کر کے انہوں نے نبوّت کو کسب انسانی سے بالاتر اور اس کے احکام کی

پابندی کو فرض بتایا تھا اور علمائ کے بارے میں کہا تھا کہ "دوسروں کا ان کی پیروی کرنا تو کجا، خود وہ بھی اپنے احکام پر اسی وقت عمل کر سکتے ہیں جب یہ احکام شرع کے مطابق ہوں"! مگر اس کے باوجود افغانی کے خلاف شورش اٹھی اور ان پر لادینی کا الزام لگانے کے لئے اس واقعہ کو طرح طرح سے توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ مثلاً یہ کہ افغانی نبوت کو صنائع میں سے ایک صنعت سمجھتا ہے یا نبوت کو انسانی کوشش سے حاصل ہو سکنے والی چیز خیال کرتا ہے اس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی کوشش ہی کے ذریعے کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے خود انبیاؑ نے بھی جہاں کوشش اور اجتہاد میں کمی کی ہے، وہاں انہیں پیچھے رہنا پڑا۔ غرض خوب خوب اس ایک واقعہ کی شکلیں مسخ کی گئیں اور اسی کو بنیاد قرار دے کر کفر کے فتوے لگائے گئے۔

ان فتووں کی اطلاع جب افغانیؒ کو دی گئی تو انہوں نے کہا "وہ مجھ پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور میں ان پر لگاتا ہوں۔ ابن سینا پر جب کفر کا فتویٰ لگایا گیا تھا تو اس نے یہ شعر پڑھا تھا۔

در دہر چو من یکے و آں ہم کافر ۔۔۔ پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

اور میرا بھی یہی جواب ہے"۔ اس تیز و تند جواب نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ دونوں طرف سے خوب گرما گرم بحثیں ہوئیں اور کھچاؤ بڑھتا گیا۔ تحسین آفندی، سلیمان بلخی اور وزیر تعلیم منیف پاشا افغانی کے طرف دار تھے۔ عالی پاشا وزیر اعظم

بھی ان کے ہمنوا تھے مگر یہ حمایت اس بے پناہ طوفان کے آگے کچھ نہ کر سکی جو شورش پسند اور رجعت طلب ملاؤں نے ہر طرف برپا کر رکھا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی جانب سے قدیم مشرقی روایات کے مطابق انہیں حج کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ قدیم زمانے میں کسی کو ملک بدر کرنے کا ایک باعزت طریقہ یہ تھا کہ اُسے بادشاہ کی طرف سے حج کو جانے کا مشورہ دیا جاتا تھا۔ یہی طریقہ افغانی کے بارے میں بھی اختیار کیا گیا۔ اور یہ مرد مجاہد مرکز خلافت سے نکل کر ۱۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو پھر مصر پہنچ گیا۔

دوبارہ مصر میں

مرکز خلافت میں قیام کرنے کے بعد افغانی کے عزائم بلند ہو چکے تھے۔ ان کی شخصیت اب بین الاقوامی شہرت کے درجے پر پہنچ چکی تھی۔ اور ترکی علما سے ٹکر لینے کے بعد رجعت پسندوں اور ہٹھوؤں کے خلاف ان کا ردعمل زیادہ شدید ہو گیا تھا اس لئے اس بار مصر میں ان کا داخلہ زیادہ نمایاں اہمیت کا حامل تھا۔

پہلے چالیس روزہ قیام کے دوران میں مصری عوام اور خصوصاً طلبہ کے دلوں پر انہوں نے اپنی محبت کے گہرے نقوش چھوڑے تھے چنانچہ جب افغانی اس بار مصر پہنچے تو ان کے عقیدت مندوں کی طرف سے شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ اور ازہر کے نوجوان طلبہ نے یہ تمنا ظاہر کی کہ افغانی مصر میں مستقل قیام کر کے ان کی تربیت کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ ان کی شہرت

وزیر اعظم ریاض پاشا تک پہنچی تو انہوں نے بھی ملاقات میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مصر میں مستقل قیام کریں اور خدیو اسمٰعیل سے ایک ہزار قرش (تقریباً دو سو روپیہ) ماہوار بطور وظیفۂ مہمانی مقرر کرادیا۔

نظامِ تعلیم کی اصلاح

مصر کے لئے یہ زمانہ بڑے آلام و مصائب کا تھا۔ ترکی سیادت وہاں برائے نام باقی رہ گئی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی سیاست کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ نہر سویز نئی نئی نکالی گئی تھی۔ اور مصر کے لئے دائمی غلامی میں جکڑے جانے کا پھندا تیار کیا جاچکا تھا۔ خدیو اسمٰعیل کی فضول خرچیوں اور تعیشات نے ملک کو قرضوں کے بے پناہ بوجھ کے نیچے دبا دیا تھا۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ملک کی مالی حالت کی نگرانی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ افغانیؒ جن کی زندگی کا نصب العین مسلمانوں کو حکمرانوں اور مغربی طاقتوں کی سحر آفریں سیاست سے نجات دلانا، ان کے اندر اپنے گردو پیش کا جائزہ لینے کا شعور پیدا کرنا اور انہیں ملک و ملت کی سالمیت اور طاقت کے حصول کے لئے ممالکِ اسلامیہ کے اتحاد کی طرف متوجہ کرنا تھا اس تماشے کو خاموش بیٹھ کر نہ دیکھ سکتے تھے انہوں نے تہیہ کر لیا کہ مصر کو اس عذاب الیم سے نجات دلا کر ہی دم لیں گے اس مقصد کے لئے ابتداءً انہوں نے جامعہ ازہر کو منتخب کیا۔ اگرچہ وہ ازہر میں معلم نہیں بنے نہ انہوں نے وہاں کا کوئی عہدہ قبول کیا لیکن اس کے باوجود

وہ ازہر کے سرکردہ علماء اور شیوخ کو اپنے ہاں بلانے اور ان تک اپنے خیالات پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے علمائے ازہر کو نصاب میں تبدیلی کی ترغیب دی۔ چنانچہ ازہر کے نصاب میں بو علی سینا کی تصانیف داخل کرائیں۔ علم الافلاک، فلسفہ اور تصوف پر خود لیکچر دیئے۔ جدید علوم و فنون کے مبادی سے طلباء کو روشناس کر دیا۔

ان لیکچروں کو بڑے شوق سے سنا اور قلمبند کیا جاتا تھا۔ اگرچہ بعض حضرات کو ان کی جدتیں مثلاً جغرافیہ کو مصنوعی کرۂ ارض کے ذریعے سمجھانا وغیرہ پسند نہ تھیں۔ تاہم افغانی کی شخصیت کے اثر نے انہیں مخالفت سے باز رکھا اور انہوں نے اس "بدعت" کو برداشت کر لیا۔ یہاں افغانیؒ کے فیض تربیت سے مویلحی، ادیب اسحاق اور مفتی عبدہٗ جیسے ہونہار ادیب، عالم، صاحب قلم اور جادو بیان مقرر پیدا ہوئے اور مادرِ وطن کی آزادی کا علم ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے۔

محفل وطنی کا قیام

ازہر میں رہ کر افغانیؒ نے دوسری جو نمایاں خدمت انجام دی وہ محفل وطنی کا قیام تھا۔ جو اپنے نصب العین کے لحاظ سے اس دورِ انحطاط میں ایک نادرہ روزگار ادارہ، تاریکی میں جلتا ہوا چراغ اور مایوسی میں مضبوط سہارا تھی۔ اس کا لائحہ عمل یہ تھا کہ ہر رکن ظاہری آسائش و آرائش کو چھوڑ کر سادہ زندگی بسر کرتا تھا، اور اس طرح اس کے اخراجات سے جو رقم بچتی تھی، اسے غریبوں کی امداد اور دیگر جماعتی مقاصد کے لئے انجمن کے صندوقچہ میں

جمع کرتا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی تہذیب نفس کی طرف بھی پوری توجہ دیتا تھا چنانچہ ہر رکن پر لازم تھا کہ اپنی زندگی کو قرآن کریم کے معیار پر جانچ کر اپنی کوتاہیوں پر نظر کیا کرے۔ ۲۴ گھنٹے میں کم از کم ایک بار قرآن کریم کا ½ پارہ غور و فکر کے ساتھ تلاوت کیا کرے۔ ادائے فرائض و نوافل، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی سختی سے پابندی کرے۔ اسلام کی تبلیغ کے لئے کوشاں رہے۔ مشنریوں کے ساتھ نرمی سے مناظرہ کرے۔ فقیروں اور محتاجوں کے ساتھ احسان کرنے کو اپنا مقصد زندگی بنائے روزانہ پابندی سے اپنا روزنامچہ لکھا کرے اور ہر روز رات کو نفس کا محاسبہ کیا کرے کہ دن میں کتنے کام اچھے کئے اور کتنے برے کئے۔

اس انجمن نے ایک ماہ کی قلیل مدت میں جو شاندار نتائج دکھائے ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے دس ہزار تومان ایرانی جمع کر لئے۔ ۱۵۰۰ مریضوں کی دیکھ بھال کا انتظام کیا۔ ۵۰۰ محتاجوں کو حسب ضرورت امداد بہم پہنچائی اور ۷۵ نادار اشخاص کو کاروبار کے لئے روپیہ دیا۔ ایسے ۲۵۰۰ اشخاص سے توبہ کرائی جو اخلاقی اور معاشرتی برائیوں مثلاً شراب نوشی، زنا، عصمت فروشی وغیرہ میں مبتلا تھے۔ انجمن کی مہم سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر انگریزی دفاتر یا کارخانوں میں کام کرنے والے ۱۸۰۔ اشخاص نے ان دفاتر اور کارخانوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ۵۰۰۔ امراء و رؤسا نے اپنا سامانِ عیش فروخت کر کے اس کا روپیہ کارِ خیر میں دیا۔ ۱۲۰۔ یہود و نصاریٰ مشرف بہ اسلام کئے گئے۔ ۴۰ مختلف جلسوں

میں غیر مسلموں سے مذہبی مباحثہ و مناظرہ کیا گیا اور ان میں ۱۲۰ - ایسے اعتراضات اُٹھائے گئے جن کا جواب مخالفین سے نہ بن پڑا۔

غرض یہ انجمن کیا تھی مسلمانوں کی ایک پرائیویٹ حکومت تھی - یہ کب تک جاری رہی اور کن حالات میں اسے ختم ہونا پڑا - اس کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا ہے۔

بے لاگ صحافت کی داغ بیل

افغانیؒ کو صحافت کا شوق اسی وقت سے تھا جب ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے وطن میں امیر شیر علی کے مشیر و مصاحب تھے انہی نے سب سے پہلا اخبار شمس النہار جاری کیا تھا جسے تمام ملک میں تقسیم کیا جاتا تھا اور غیر ممالک میں بھی بھیجا جاتا تھا۔

جس زمانے میں افغانیؒ دوبارہ مصر میں وارد ہوئے، اس وقت وہاں صحافت کی یہ حالت تھی کہ سارے مصر میں صرف اسکندریہ سے دو چھوٹے چھوٹے اخبار نکلتے تھے - اور وہ بھی ملکی و غیر ملکی سیاسیات سے الگ رہتے ہوئے صرف یورپین آبادی یا حکومت کے ملازمین کو خبریں پہنچاتے تھے - اظہار رائے یا تنقید کا عنصر ان میں نام کو بھی نہ ہوتا تھا - اور مصر میں آج تک اس قسم کی معیاری صحافت کا تجربہ ہی نہیں کیا گیا تھا - سید صاحب نے چند معیاری جرائد "مصر" محروسہ اور "مرآۃ الشرق" جاری کرائے - ان میں خود بھی اہم سیاسی مضامین لکھے اور اپنے شاگردوں سے بھی لکھوائے - چونکہ ان مضامین کا رخ زیادہ مغربی حکمت عملی کی طرف ہوتا تھا۔

اس لیئے حکومت مصر نے اُن سے کوئی تعرض نہ کیا کیونکہ اس وقت خدیو اسمٰعیل کی پالیسی یہ تھی کہ یوروپین سیاست پر یہ دباؤ پڑتا رہے کہ مصر میں ایک قومی تحریک زندہ ہے، چنانچہ وہ ان اخبارات کی اس تلخ نکتہ چینی کو بھی برداشت کرتا رہا جو وہ کبھی کبھی خود خدیو کی پالیسی پر کیا کرتے تھے.

ان اخبارات میں افغانی خود مظہر بن وضّاح کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے چنانچہ ان کی تحریر و تقریر اور علمی و سیاسی مجالس سے متاثر ہو کر مصر میں وہ نئے ادیب اور اخبار نویس پیدا ہوئے جنہوں نے بے لاگ تنقید اور اظہار رائے کو اپنے قلم کا طرۂ امتیاز بنایا - ادیب اسحٰق سعد زاغلول، عبداللہ نعیم بے اور احسان بے وغیرہ اس دور میں آسمان صحافت کے درخشندہ ستارے تھے - اور یہ سب سیّد صاحب کے فیض صحبت سے اس مرتبہ کو پہنچے تھے - ان میں سب سے زیادہ پُر جوش شخص ادیب اسحٰق تھے - جنہوں نے سیّد صاحب سے اخبار نویسی کا فن سیکھا اور ۱۸۷۷ء میں اپنا پہلا عربی اخبار "المصر" کے نام سے جاری کیا - اس وقت ادیب اسحٰق کی عمر کل اٹھارہ سال تھی - اور اخبار جاری کرنے کے لئے ان کی جیب میں کل ساڑھے گیارہ روپے موجود تھے - مگر اس کے باوجود ان کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا اور انہوں نے اسی سرمایہ سے کام شروع کر کے بہت جلد مشکلات پر قابو پا لیا - اور چند روز میں ہی اخبار خوب چل نکلا - اس اخبار میں افغانی کے وہ تمام خطبات شائع ہوا کرتے تھے جو وہ جامع ازہر میں دیا کرتے تھے

ادیب اسحاق ہی نے ایک دوسرا روزنامہ "التجارۃ" کے نام سے جاری کیا بقول جرجی زیدان ان دونوں جرائد سے عوام میں سیاسی شعور بیدار ہونے اور آزادانہ اظہار خیال کا جذبہ پیدا ہونے میں بڑی مدد ملی اور جمود اور بے حسی کی فضا میں ایک اہتزاز پیدا ہونے لگا۔ آخر کار حکومت نے دونوں اخبار بند کر دیئے۔

مصری صحافت میں جمال الدین افغانی کا دوسرا پرجوش عقیدت مند ایک یہودی اخبار نویس جیمس سنا تھا۔ ابتداً وہ افغانی کا مخالف تھا لیکن ان سے روشناسی اور قربت حاصل کرنے کے بعد ان کا زبردست عقیدت مند بن گیا تھا۔ اس کی مالی حالت بہتر نہ تھی۔ بڑی عسرت میں زندگی بسر کرتا تھا۔ افغانیؒ نے خود ہی اسے مالی امداد دی۔ اور اس سے ایک اخبار "ابو نظارہ" جاری کرایا۔ اس اخبار کو لکھنؤ کا اودھ پنچ سمجھنا چاہیئے۔ مزاح و ذکاوت کے انداز میں حکومت پر نکتہ چینی کرنا اور وزرا اور عمال کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا اس کا مقصد تھا۔ حکومت کا احتساب اسے بھی برداشت نہ کر سکا۔ ابو نظارہ بند کر دیا گیا اور جیمس سنا کو بھی خارج البلد کر دیا گیا۔

افغانیؒ کی ان کوششوں سے سارے مصر میں عام بیداری پیدا ہو گئی اور غیر ملکی مداخلت کے خلاف جذبات بھڑک اُٹھے۔ یہاں ان واقعات کی تفصیل کا موقع نہیں۔ جو مصر میں سیاسی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ مختصراً واقعات یہ ہیں کہ خدیو اسمٰعیل جو طبعاً نرم آدمی تھا، عوام کے بڑھتے ہوئے جوش و خروش کا

ساتھ نہ دے سکتا تھا - چنانچہ عوام نے اُسے اپنے مقصد کے حصول کے راستے میں ایک سنگ گراں سمجھا اور اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے - خدیو کو جب اس خطرے کا احساس ہوا تو اس نے عوام کو خوش کرنے کی خاطر آئین اصلاحات نافذ کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن اس کی پیش کش قبول نہ کی گئی - خدیو اسمٰعیل کی اس مخالفت میں در پردہ افغانی کی ہدایت بھی شامل تھی - بہر حال عوام میں خدیو اسمٰعیل کے خلاف اس قدر شورش پھیل گئی کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا - یوروپین سیاست اس فتنے کو بڑھا کر اپنے آپ کو زیادہ مشکلات میں پھنسانا نہیں چاہتی تھی - اس نے سلطانِ ترکی پر دباؤ ڈالا کہ خدیو اسمٰعیل کو معزول کر کے اس کی جگہ توفیق بے کو خدیو مقرر کر دیا جائے - سلطان نے ان کے دباؤ سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا دیا اور مصر کی عنانِ حکومت توفیق بے کے ہاتھوں میں دے دی گئی - اقتدار و سطوت کی مسند پر بیٹھنے سے پہلے توفیق بے کے متعلق لوگوں کے جذبات یہی تھے کہ وہ بہت اچھا قوم پرست اور محب وطن انسان ہے - چنانچہ اس کے برسرِ اقتدار آنے پر سب سے زیادہ خوشی قوم پرست طبقے کو ہوئی - اور اس کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر دی گئیں - لیکن اس کی قوم پرستی سراب نکلی - واقعات نے ثابت کر دیا کہ توفیق اور خدیو توفیق میں بڑا فرق ہے - خدیو اسمٰعیل کی نرمی یورپی استعمار کے مقابلے میں جہاں مصریوں کے لئے ایک رکاوٹ تھی - وہاں قومی عناصر کے حق میں کبھی کبھی مفید بھی ثابت ہو جاتی تھی - لیکن خدیو توفیق

کی سختی کا رخ صرف ایک ہی سمت کو تھا۔ اور محض قوم کو کچلنے کے لئے بروئے کار آئی۔ برسر اقتدار آتے ہی اس نے ان طاقتوں کا زور کم کرنا چاہا جو اس کی حکومت کے خلاف شورش پیدا کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے اس نے وزیر اعظم شریف پاشا کو ان کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ شریف پاشا افغانی کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور قوم پرستوں کے زبردست حامی تھے۔ ان کی جگہ ایک شخص ریاض پاشا کو وزیر اعظم بنایا جو توفیق بے کے ڈھب کا آدمی تھا اس واقعہ نے قوم پرستوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سمجھ گئے کہ ہوا کا رخ کدھر کو ہے۔

مصر سے جلا وطنی

شریف پاشا کے بعد خدیو توفیق کی نظر عتاب جمال الدین افغانی پر پڑی کیونکہ ان کا وجود خدیو اور دول خارجہ کے قنصل خانوں، دونوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ چنانچہ نامعلوم فوری سبب کی بنا پر ایک دن رات کو دو بجے ایک دستۂ فوج نے افغانیؒ کی قیام گاہ واقع خان خلیل کا محاصرہ کر لیا۔ ان کو سوتے سے جگایا گیا۔ وہ صرف جلابہ (لمبا کرتا) پہنے سو رہے تھے۔ اسی حالت میں انہیں سپیشل ٹرین میں بٹھا کر سویز بھیج دیا گیا۔ عثمان غالب افسر پولیس نے اُن کی ایک ہزار کتابیں بھی ضبط کر لیں۔ اور اس طرح بے سر و سامانی کی حالت میں وہ مصر سے رخصت ہو گئے۔ جونہی یہ خبر مصری عوام میں مشہور ہوئی۔

سب طرف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور قریب تھا کہ فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اُٹھے لیکن حکومت نے اسے سختی سے دبا دیا۔ یہ واقعہ ستمبر ۱۸۷۹ء کا ہے۔ اس موقع پر ایرانی سفیر نے افغانی رح کی خدمت میں تین ہزار پونڈ کی رقم یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ آپ اپنی بے سروسامانی کو اس رقم سے دور کیجئے۔ مگر افغانی رح نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سفیر ایران نے سویز جا کر یہ رقم افغانی رح کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے تحقیر کے لہجے میں جواب دیا "اس رقم کو تم ہی اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے زیادہ تم کو اس کی ضرورت ہے۔ شیر تو جہاں جاتا ہے اپنے لئے خود غذا پیدا کر لیتا ہے۔"

بہر حال مخالفین نے افغانی رح کے جسم کو مصر سے نکال دیا لیکن ان کی روح وہاں سے نہ نکل سکی۔ کچھ زیادہ مدت نہ گزرنے پائی تھی کہ ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور مصر میں کاشتکاروں کی وہ تحریک چلی جو فتنۂ اعرابین کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ اسی طرح مہدی سوڈانی کی تحریک چلی جس میں افغانی رح کے معتقدین اور شاگردوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور بعد میں سعد زاغلول پاشا نے ان کے جانشین کی حیثیت سے مصری سیاست میں ان کے نصب العین کی حفاظت کی۔

فان تسجنوا القسری لا تسجنوا اسمہٗ
ولا تسجنوا معروفہٗ فی القبائل

چوتھی بار ہندوستان میں

مصر سے نکل کر سید صاحب پھر ہندوستان آئے۔ یہ ان کے دورکا اب چوتھا واقعہ تھا۔ پہلے وہ بمبئی پہنچے۔ پھر عازم حیدرآباد ہوئے۔ معلوم نہیں وہ اس بار کیا اُمنگیں لے کر یہاں آئے ہوں گے۔ لیکن یہاں انگریزی سیاست نے فضا کو بری طرح مسموم کر رکھا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد جوش اور ولولہ کی چنگاریاں بجھ کر راکھ بن چکی تھیں اور وقت کا کوئی تیز سا جھکڑ بھی انہیں پھر سے تاباں و فروزاں نہ کر سکتا تھا اس لئے یہاں افغانیؒ کی سرگرمیاں تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے رسالہ "معلم شفیق" اور "معلم" میں چند مقالات لکھے۔ بعض مقامات پر مفید لیکچر دیئے۔ اور نیچریوں کے رد میں ایک مختصر رسالہ لکھا۔ یہ تمام مقالے فارسی زبان میں لکھے گئے۔ اور یک جائی شکل میں ہندوستان اور ایران سے شائع کئے گئے۔ ان میں نمایاں مقالے دو ہیں۔ ایک تعلیم کے بارے میں ہے۔ جس میں علوم کے اندر مشرقی و مغربی کی تقسیم کو ناجائز قرار دے کر اچھی چیز کو حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسرا مقالہ عقائد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں افغانیؒ نے سر سید کے مذہبی خیالات پر نکتہ چینی کی ہے۔ ان کا ایک اور مقالہ حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پر تھا۔ اس موضوع پر انہوں نے اور بھی کئی مضامین لکھے تھے۔ ان کے خیال میں ہندوستان میں سیاسی شعور اور قومی خودداری

کو فنا کرنے والی جماعتیں دو تھیں ایک سر سیّد اور ان کے رفقاء کی اور دوسری والیانِ ریاست کی۔ اوّل الذکر کے خلاف انہوں نے ہندوستان ہی میں قلم اٹھا لیا اور تفسیر مفسر شرح حال اور مردِ نیچریتین مضامین یکے بعد دیگرے لکھے دوسری جماعت کے خلاف انہوں نے نہ تو ہندوستان میں کوئی قدم اٹھایا اور نہ یہاں سے جا کر، شاید اس لئے کہ ان کے خلاف براہِ راست حملہ کرنا اتحادِ اسلامی کے مقصد کے منافی ہوتا۔ تاہم عروۃ الوثقیٰ کے شذرات میں انہوں نے ان کے خلاف بھی جا بجا لکھا ہے۔

راقم الحروف کے نانا مولانا عبدالحق مرحوم (متوطن جہانگیرہ ضلع پشاور) ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ "جب افغانیؒ حیدرآباد تشریف لائے تو شہر سے باہر غالباً سالار جنگ کی قیام گاہ پر ٹھہرے تھے۔ افغانی طلبہ ایک وفد کی صورت میں ان سے ملنے کے لئے گئے۔ افغانی طلبہ میں وہ زیادہ تر "جمال الدین فلسفی" مشہور تھے۔ انہوں نے طلبہ کے سامنے ایک فصیح و بلیغ تقریر کی۔ اور ان راستوں کی تفصیل بتائی جن سے ہندوستان پر حملہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ یہاں وہ اب بھی عام طور پر ایک طرح نظر بند سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے اس غلط فہمی میں ان سے دوبارہ ملاقات کا موقع نصیب نہ ہوا۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانیؒ یہاں اگرچہ عملاً کوئی سیاسی

سرگرمی جاری نہ رکھ سکے لیکن ان کا ذہن ہندوستان کی آزادی کی تدبیریں ضرور سوچتا تھا۔

کلکتے میں نظربندی

ان ہی دنوں مصر میں اعرابی پاشا کی تحریک اٹھی۔ اعرابی پاشا مصر کے فلاحین یعنی کاشتکاروں کے خاندان کے ایک رکن تھے۔ اور ترقی کرتے کرتے وزیر جنگ کے عہدے تک جا پہنچے تھے۔ چونکہ وہ مصر کی ایک انقلابی جماعت سے وابستہ تھے۔ اس لئے برطانوی سیاست ان کے اثر کو ختم کرنا اور انہیں ان کے عہدے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ اس سے فوج میں بغاوت پھیل گئی جن کو بالآخر طاقت کے زور سے دبا دیا گیا۔ ستمبر ۱۸۸۲ء کا زمانہ اعرابی پاشا کی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ اس وقت اعرابی پاشا نے کہیں فخریہ یہ کہہ دیا کہ میں ہندوستان میں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کرا سکتا ہوں۔ اس فقرے کا مطلب یہ لیا گیا کہ ہندوستان میں افغانی کی موجودگی کے بل بوتے پر اعرابی پاشا نے یہ دھمکی دی ہے۔ چنانچہ اسی وقت افغانی کو سرکاری حراست میں لے لیا گیا اور حیدرآباد سے کلکتہ لے جا کر نظربند کر دیا گیا۔ یہ تحریک اسی سال مصر میں ختم ہو گئی اور سید صاحب کی نظربندی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

کابل کو مراجعت

رہائی کے بعد سیدھے کابل پہنچے۔ اور تقریباً چار ماہ تک وہاں قیام کیا۔ اس دوران میں آپ نے امیر عبدالرحمٰن کو دستوری حکومت پر آمادہ کرنا چاہا اور اصلاحات کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ امیر نے آپ کی ظاہری خاطر تواضع تو بہت کی مگر اصلاحات کے بارے

میں آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ آخر کار آپ وہاں سے چل پڑے۔ ہندوستان واپس آئے اور بھوپال ہوتے ہوئے ہندوستان سے لندن اور وہاں چند روز قیام کر کے پیرس چلے گئے۔

پیرس میں

پیرس میں افغانی کی آمد کا سب سے بڑا مقصد اپنے لئے ایک آزاد نشر گاہ تلاش کرنا تھا۔ چنانچہ آپ نے وہاں کے مشہور روزناموں اور علمی رسائل میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ ان دنوں فرانس کے مشہور فلسفی "رینان" نے فرانس کے دار الفنون میں "اسلام اور علم" کے موضوع پر ایک لیکچر دیا تھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اسلام نے اگرچہ شروع شروع میں علوم کی حوصلہ افزائی کی مگر بعد میں انہیں سختی سے دبا دیا گیا۔ اس کے جواب میں افغانیؒ نے وہاں کے مشہور مجلہ "ژورنل دی با" میں ایک مضمون لکھا جو بہت دلچسپی سے پڑھا گیا۔ رینان نے اس کے جواب میں دوسرا مضمون لکھا۔ اس میں وہ اپنے دعوے سے دست بردار تو نہیں ہوا۔ مگر سیّد صاحب کی قابلیت اور شخصیت کا اعتراف بڑی کشادہ دلی سے کیا۔ لیکن افغانیؒ اس اس بحث و تمحیص میں اُلجھ کر اپنے مقصد کو فوت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس جواب الجواب کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور یہ سلسلہ یہیں ختم ہو گیا۔

العروۃ الوثقیٰ

پیرس میں جب افغانیؒ کے قیام کو چند ماہ گزر گئے تو ان کے رفیق اور مخلص شاگرد شیخ محمد عبدہٗ بھی ان کی خدمت میں

پیرس پہنچ گئے ۔ سعد زاغلول بھی آملے ۔ ایک اور خاص معاون مرزا باقر ایرانی بھی لندن سے یہاں آگئے ۔ ان رفقاء کی معیت میں افغانی ؒ نے ایک جماعت قائم کی جس کا نام الجمعیتہ العروۃ الوثقٰی الخیریتہ رکھا۔ اس کے ساتھ ہی سب سے پہلا ضروری کام یہ سمجھا کہ پیرس کی آزاد سرزمین سے مشرقی ممالک میں اپنا پیغام پہنچانے کے لئے العروۃ الوثقٰی کے نام سے ایک ہفتہ وار جریدہ شائع کریں ۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ہی اس اخبار کی داغ بیل بھی ڈال دی۔

افغانی ؒ کی مالی حالت ان دنوں کچھ اچھی نہ تھی۔ مگر ان کے عزم صمیم کو دولت کے انتظار کی زحمت گوارا نہ تھی ۔ اخبار جاری ہو جانے کے بعد اس کے چلنے کے اسباب بھی خود بخود مہیا ہو گئے ۔ کہا جاتا ہے کہ حیدر آباد سے مالی امداد ملتی رہی واللہ اعلم۔

اس اخبار کے اغراض و مقاصد خود افغانی کے الفاظ میں یہ تھے۔

"یہ اخبار سمجھائے گا کہ حوادث زمانہ کی مدافعت کے لئے طاقت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ان اصولوں پر مضبوطی سے کاربند ہونا ہے۔ جن پر ہمارے اسلاف عمل پیرا رہے ۔ دول یورپ نے بھی انہی پر عمل کر کے ترقی حاصل کی ہے ....."

"یہ اخبار سمجھائے گا کہ ملکی معاہدوں اور سیاسی تعلقات کی حفاظت کے لئے بنیادی اور اکتسابی قوتوں میں فریقین کا توازن ضروری ہے ۔ توازن نہ ہو تو دوستانہ معاہدوں اور روابط ہی کے ذریعے مضبوط طاقتیں کمزوروں کو ہڑپ

کر جاتی ہیں۔"

یہ اخبار دوستی کی اس منقّش چادر کو چاک کر کے اس کے پس پردہ رازوں کو آشکارا کرے گا جسے مہربانی اور تلطف کے رنگا رنگ نقش و نگار اور حسن معاملہ کی دلفریب تصویروں سے مزین کیا گیا ہے۔

یہ اخبار اس غلط خیال کو مٹائے گا کہ مسلمان اپنے اسلاف کے قائم کردہ اصول کامیابی پر عمل پیرا ہو کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اور دنیا کی سیاسیات کا جو اثر اہل مشرق پر پڑ سکتا ہے اور اہل سیاست مشرق کے بارے میں جن مسائل کو اپنے ہاتھ میں لینگے۔ یہ اخبار اُن نشیب و فراز سے انہیں باخبر رکھے گا۔

یہ اخبار ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھے گا کہ اقوام کے باہمی تعلقات مضبوط رہیں۔ ان کے افراد میں الفت و مودّت قائم رہے، باہمی تعاون کی تائید ہوتی رہے اور سیاسیات میں وہ صحیح راستہ اختیار کر لیا جائے جو ظلم اور اہل مشرق کی حق تلفی پر منتج نہ ہو۔

العروۃ الوثقٰی کا پہلا شمارہ ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلا۔ اس کی لوح پر افغانی اور شیخ عبدہ دونوں کے نام تھے۔ اس کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر ہاتھ میں اسے بلا قیمت پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کے مضامین میں ہنگامی جوش و خروش بھی ہوتا تھا اور دائمی استواری بھی۔ پہلے ہی دن سے ان مضامین نے مشرق و مغرب کی صحافت میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ پرچہ اگرچہ عربی زبان

میں تھا لیکن اپنی دل چسپی، ہر دل عزیزی اور اہمیت کے باعث تقریباً ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہوتا تھا۔ مصری عوام کو افغانی اور محمد عبدہٗ سے خاص عقیدت تھی۔ اس لئے مصر میں یہ پرچہ خصوصیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مقبول ہوا۔ بالآخر حکومت مصر نے اپنے ہاں اس کا داخلہ بند کر دیا۔ اس کے بعد نامعلوم اسباب کی بنا پر یہ اخبار خود بھی بند ہو گیا۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء تک اس کے کل اٹھارہ شمارے شائع ہوئے تھے۔ مگر ان اٹھارہ پرچوں ہی نے عالم اسلامی کے بظاہر پرسکون سمندر میں وہ تلاطم پیدا کر دیا کہ بہت سے قنصل خانوں کا سکون اور سفیروں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ عروۃ الوثقیٰ ایک پیغام تھا جو افغانی رحؒ نے اپنی پختگیٔ افکار کے بعد دنیا کو دینا چاہا تھا۔ اور عالم اسلامی کا اتحاد، طاقت اور اقتدار کا حصول اور صحیح نظام سیاست پر چل کر اس اتحاد اقتدار کا تحفظ اس کا نصب العین تھا۔ اگر افغانی اپنے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ یقیناً دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مجدّد کہلانے کے حق دار تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس خواب کے شرمندۂ تعبیر ہونے کے اسباب مہیا نہ ہو سکے۔

موسیو بلنٹ قیام یورپ کے دوران میں افغانی نے کافی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ اور اس میں عروۃ الوثقیٰ کی اشاعت اور ان کی زندہ صحافت کا بڑا حصہ تھا۔ اس زمانے میں ایک انگریز دوست موسیو بلنٹ

ملا۔ وہ افغانی رح کے نظریات سے حرف بہ حرف متفق تھا۔ اور اکثر ان سے اسلامی ممالک کے بارے میں مشورے کیا کرتا تھا۔ اگرچہ انگریزی میں اسے کوئی مقام حاصل نہ تھا اور اس کی قوم اسے ایک مجذوب اور سڑی سمجھتی تھی لیکن وہ اپنے طور پر یہ چاہتا تھا کہ انگریزوں اور مصریوں کی آویزش پُرامن اور آبرومندانہ طور پر طے ہو جائے۔

مصر اور برطانیہ میں مصالحت کی ناکام کوشش

اسی زمانے میں مصری سوڈان کے اندر مہدی سوڈانی کی تحریک زور و شور سے اُٹھی اور اسے فرو کرنے کے لئے ۱۸۸۴ء کے شروع میں جنرل گارڈن کو سوڈان بھیجا گیا۔ خرطوم پہنچ کر گارڈن محصور ہو گیا۔ امداد کے لئے انگلستان سے کمک بھیجی گئی جو دیر میں پہنچی اور گارڈن کے تمام سپاہیوں کو مہدی کے حامیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۲۶ جنوری ۱۸۸۵ء کو گارڈن بھی مارا گیا اور خرطوم پر مہدی کا قبضہ ہو گیا۔ اس عرصہ میں بلنٹ نے سیّد صاحب کو بیچ میں ڈال کر یہ کوشش کی کہ مہدی سوڈانی اور انگریزوں کا معاملہ صلح و آشتی کی فضا میں طے ہو جائے۔ اور گارڈن کو اس مخمصے سے کسی طرح بچا لیا جائے۔ گارڈن باوجودیکہ اتحادِ اسلامی کا سخت مخالف تھا۔ اور افغانی رح اس کے پرجوش داعی۔ لیکن اس کے باوجود وہ بلنٹ کے کہنے پر اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر انگریز کسی

طرح صلح کی گفت وشنید پر راضی نہ ہوئے اور گارڈن کا کام تمام ہو گیا۔

جب سیّد صاحب نے اچھی طرح یہ دیکھ لیا کہ انگریز مصر کے بارے میں کسی طرح صلح پر آمادہ نہیں ہیں تو انہوں نے ابراہیم نامی ایک شخص کو لکھا کہ "اگر انگریز مصر کے معاملے میں مصالحانہ طریقہ اختیار کرنے پر رضامند نہیں ہیں تو میں افغانستان جا کر انگریزوں کے خلاف دشواریاں پیدا کروں گا۔" اس وقت انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ روس ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ اس لیئے انگریز چاہتے تھے کہ کسی طرح افغانستان کو اپنے ساتھ ملائے رکھیں۔ ایسے موقع پر افغانی جیسی شخصیت کی ایک معمولی سی تحریک بھی انگریزوں کے لیئے کافی مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب یہ خط بلنٹ کی نظر پڑا تو وہ فوراً انڈیا آفس میں وزیر ہند مسٹر انڈلف چرچل سے ملنے گیا۔ اور اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مصر اور افغانستان دونوں ممالک کے بارے میں سیّد صاحب سے گفت وشنید کرے ورنہ معاملہ حد سے بڑھ جائے گا۔ چنانچہ طے ہوا کہ افغانیؒ کو لندن بلایا جائے اور بلنٹ کی قیام گاہ پر دونوں کی ملاقات کرائی جائے۔ بلنٹ نے افغانیؒ کو لکھا کہ آپ فوراً لندن پہنچیے۔ افغانیؒ نے جواب دیا میں برطانوی حکام سے مایوس ہو چکا ہوں۔ مصر کا معاملہ افغانستان کے معاملے سے وابستہ ہے۔ پہلے میں وہاں جاؤں گا۔ اور وہاں سے واپس آ کر کوئی گفت وشنید کروں گا۔" آخر مسٹر بلنٹ کے بے حد اصرار پر افغانیؒ شیخ محمد عبدہٗ کی معیت میں لندن روانہ ہوئے

بلنٹ ہی کی قیام گاہ پران کی اور وزیر ہند کی ملاقات ہوئی جو چھتالیس منٹ جاری رہی - افغانی نے وزیر ہند کو سمجھایا کہ روس ممالک اسلامیہ سے زیادہ برطانیہ کے لئے خطرناک ہے - اس لئے برطانیہ کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور عرب سے اتحاد کرنا چاہئے - اور مصر سے فوجیں ہٹا لینی چاہئیں - افغانی کا کمال یہ تھا کہ وہ یہ مسئلہ وزیر ہند کو اس نقطۂ نگاہ سے سمجھا سکے جس نقطۂ نگاہ سے انگریز اسے بظاہر سمجھنا چاہتے تھے دو تین مہینے تک بلنٹ اس کوشش میں بھی رہا کہ افغانی کی وساطت سے دولتِ عثمانیہ و برطانیہ میں صلح کرادی جائے - اور پھر دولتِ عثمانیہ، ایران، اور افغان کا اتحاد قائم کرکے روس کے خلاف متحدہ محاذ بنایا جائے - انگریزی وزارت خارجہ اس پر آمادہ ہوگئی اور طے پایا کہ وزیر ہند قسطنطنیہ جائیں اور جمال الدین افغانی ان کے ساتھ ہوں لیکن بعد میں وزیر ہند نے نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر وزارت خارجہ کو ایک تار بھیج دیا - اور وزارت خارجہ نے اس تجویز پر عمل کرنے سے انکار کردیا -

روس اور ایران کا سفر

اب افغانی نے دوسرے رخ پر سوچنا شروع کیا یعنی افغانستان، ایران کا روس سے اتحاد - چناں چہ ۱۸۸۵ء کے اواخر میں وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے روس پہنچے - وہاں ان کی کوششوں کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہ ہوسکے - تاہم اس سفر کا یہ

نتیجہ ضرور نکلا کہ روس کے غریب اور بے کس مسلمانوں کو قرآن مجید اور دیگر مذہبی کتابوں کی اشاعت کی اجازت مل گئی۔ لیکن وہ مقصد جس کے لئے افغانی روس گئے تھے پورا نہ ہوا۔

جون ۱۸۸۶ء میں افغانی بوشہرہ پہنچے۔ حاجی خان مرحوم وزیر مسقط کے ہاں قیام کیا۔ اور ایران کے ارباب اقتدار سے تعارف ہوا۔ اکتوبر میں اعتماد السلطنت نے شاہ ایران کی طرف سے انہیں طہران بلایا۔ چنانچہ افغانی دس روز اصفہان میں ظل السلطانی کے پاس بطور مہمان ٹھہرتے ہوئے اور یزد و کاشان ہوتے ہوئے مارچ ۱۸۸۷ء کو طہران پہنچے۔ طہران میں حکومت کی جانب سے ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ شاہ ایران سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا "آپ مجھ سے کیا مانگتے ہیں" افغانی نے جوابدیا "دو کان"۔ اس جواب سے بادشاہ پریشان اور کچھ ناراض ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ خود غرضوں نے بادشاہ کو ورغلایا بھی اور کہا کہ اگر چند روز افغانی یہاں رہ گئے تو شاہ ایران کو سلطنت ہی سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔ آخر کار افغانی کو ایران سے جانے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اور انہوں نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ اب افغانی دوبارہ روس پہنچے اور تقریباً دو سال تک وہاں قیام کیا۔ خرچ ظل السلطان ایران سے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن یہ سفر بھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ رہا۔ روس میں افغانی کے دوست تکوف کا انتقال ہو گیا اور ظل السلطان خرچ بھیجنے کے قابل نہ رہے

اور روسی وزارتِ خارجہ افغانی کی تدابیر کو سمجھ نہ سکی۔ نتیجہ یہ کہ افغانیؒ کو وہاں سے بھی ہٹنا پڑا۔

اب وہ جرمنی پہنچے اور وہاں سے پیرس گئے۔ اس سفر میں شاہِ ایران سے دوبارہ ملاقات ہوئی جس میں بادشاہ نے انہیں ایران بلانے پر پھر اصرار کیا اور اس بارے میں بہت سے عہد و پیمان کئے۔ امین السلطنت شاہ کے ہمراہ تھے جن کے متعلق روسی حکومت کا خیال تھا کہ وہ انگریزوں کے حامی ہیں۔ شاہ ایران خود روس کے بڑے حامی نظر آتے تھے لیکن امین السلطنت کے متعلق جو غلط فہمی روسیوں کو ہو گئی تھی۔ اس کی بنا پر وہ ایران سے کچھ مطمئن نہ ہوتے تھے۔ امین السلطنت نے افغانیؒ کو راضی کیا کہ وہ ایران آنے سے پیشتر روس جائیں اور وہاں روسی حکومت کو ان کی طرف سے اطمینان دلائیں۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق افغانی فرانس سے روس پہنچے۔ ادھر امین السلطنت نے بادشاہ کو افغانی کی طرف سے غافل اور بددل کرنا شروع کر دیا۔ دو مہینے تک بادشاہ ان کو بالکل بھول گیا۔ اب جو روس سے واپس ہو کر سیّد صاحب ایران پہنچے تو بڑے مایوس ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بڑا پُر جوش استقبال کیا جائے گا اور بادشاہ انہیں کسی اعلیٰ عہدے پر مامور کرے گا۔ لیکن وہاں کسی نے پوچھا تک نہیں۔ خیر، افغانی حاجی محمد حسن کے ہاں ٹھہرے اور اس انتظار میں رہے کہ بادشاہ کی طرف سے دعوت نامہ آئے گا۔ لیکن کسی نے خبر تک بھی نہ لی۔

آخر افغانی نے خود ہی یاد دہانی کے طور پر خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا" میں نے اپنے وعدے پورے کر کے تمام کام سرانجام دے دیئے - اور اب صزب خانہ میں آکر مقیم ہوا ہوں - اگر آپ اپنے عہد پر قائم ہیں تو میں آجاؤں گا - بشرطیکہ آپ دوسروں کی غلط بیانیوں پر کان نہ دھریں - اور اگر اس وعدے کا انجام بھی پہلے ہی کی طرح ہونا ہے تو یہیں سے واپسی کی اجازت دیجئے تاکہ معترضین کو کان بھرنے کا موقع نہ ملے اور آپ پر وعدہ خلافی کا الزام نہ آئے" اس کے جواب میں شاہ ایران نے لکھا کہ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں - آپ صدر اعظم کے دولت کدے پر قیام فرمائیں، افغانی نے اس پیش کش کو صاف ٹھکرا دیا اور حاجی محمد حسین کے مکان ہی کو اپنے قیام کے لئے ترجیح دی - لیکن بادشاہ نے اب بھی کوئی توجہ نہ دی - اس طرز عمل سے افغانی نے یہ تہیہ کر لیا کہ ایران کی سرزمین کو چھوڑنے سے پہلے وہ امین السلطنت کی غداری کا پول کھول کر رہیں گے۔ چنانچہ وہ طہران سے رخصت ہو کر بست میں مقیم ہو گئے وہاں سے ایک خط شاہ ایران کو لکھا جس میں گزشتہ واقعات یاد دلا کر اپنی مظلومیت ظاہر کی گئی تھی - اس کا کوئی جواب نہ آیا - اب افغانی نے طے کر لیا کہ وہ اس بدعنوانی کو بے نقاب کئے بغیر نہ رہیں گے۔

ایران کے عوام بادشاہ کی عیاشیوں، اس کے حواریوں کی عیاریوں اور انگریزی تصرفات کے بڑھتے ہوئے طوفان کی وجہ سے فرماں روائے ایران سے

بدظن تھے۔ چنانچہ افغانی کی تقریروں نے چند ہی روز میں ان کے اندر جوش و خروش بھر دیا۔ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے کہا۔

"میں ظالم اور مظلوم دونوں سے دشمنی رکھتا ہوں۔ ظالم سے اس لئے کہ وہ ظلم کرتا ہے۔ اور مظلوم سے اس لئے کہ وہ ظلم قبول کر کے ظالم کو زیادتی کا حوصلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔"

اس قسم کی چند تقریروں نے آگ لگا دی اور جگہ جگہ انجمنیں اور مجلسیں قائم ہونے لگیں۔ صدر اعظم کو جب معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ کوئی اور تدبیر نہ سوجھی تو ایک روز اچانک ۵۰ سوار بھیج کر افغانی کو بیماری کی حالت میں حراست میں لے لیا۔ اسی حالت میں انہیں یابو کی کمر سے باندھ کر بٹھایا گیا اور خانقین تک پہنچا دیا گیا۔ افغانی کے میزبان امین الضرب کو اطلاع ملی تو فوراً کچھ زادِ راہ اور لباس ان کے لئے بھیجا۔ اور افسروں کو بھی کچھ دیا تاکہ افغانی کو راستے میں کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔

خانقین سے روانہ ہو کر افغانی بغداد اور پھر بصرہ پہنچے اور چند روز وہاں مقیم رہے۔ انقلاب کا جو پودا انہوں نے ایران میں لگایا تھا وہ اب اُسے بار آور دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے طریق کار کی تلاش تھی۔ اتفاقاً ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس نے خود بخود اس کے لئے فضا تیار کر دی۔ ۷ مارچ ۱۸۹۰ء کو شاہِ ایران نے تمام ملک میں تمباکو کا ٹھیکہ ایک یوروپین کمپنی کو

دے دیا۔ اور اس کمپنی نے دس کروڑ کے سرمایہ سے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس اجارہ داری کے خلاف سب سے پہلی آواز ملکم خان سفیر ایران مقیم لندن نے بلند کی۔ جس کے صلے میں اُسے معزول کر دیا گیا۔ افغانی نے بھی اسی تمباکو کے مسئلہ کو لے کر مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کو ایک زوردار خط لکھا جس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے:۔

اے امام اعظم بے شک بادشاہ کی قوت ارادی کمزور ہے اس کی سیرت خراب ہے، اس کا دل گندہ ہے، وہ ملک پر حکومت کرنے کے قابل نہیں اس نے حکومت کی باگیں ایک ظالم و بے دین اور غاصب کے سپرد کر دی ہیں اور رسول پر علانیہ استہزا کرتا ہے شریعتِ حقّہ کی پروا نہیں کرتا اور علما پر لعنت بھیجتا ہے .... علانیہ شراب پیتا ہے۔ اور کفّار کی صحبتوں میں وقت گزارتا ہے یہ ہے اس کا چال چلن۔ مگر اس کے علاوہ اب اس نے ایرانی زمین کا بڑا حصہ معہ اس کے منافع کے کفار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سڑکیں، کاروان سرائیں، باغات کھیت سب ہی کچھ بیچ ڈالے ہیں۔ نیز دریائے کارون، مہمان خانے عمارتیں سرائیں۔ غرض سب ہی کچھ کفّار کو سونپ دئے ہیں، بلکہ تمباکو کی تمام پیداوار اور انگور جن سے شراب بنائی جاتی ہے، مع

کارخانوں اور سامان تجارت کے، نیز موم، صابن اور شکر بنانے کے کارخانے اپنے متعلّقات سمیت کفّار کی نذر کر دیے ہیں۔

اس خط کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اور مجتہدین ایران نے متفق ہو کر تمباکو کے استعمال کے خلاف فتویٰ صادر کر دیا۔ فتویٰ کا کُل مضمون یہ تھا "بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم آج سے تمباکو کا استعمال خواہ کسی صورت میں ہو، امامِ وقت سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے"۔ اس کا اثر اتنا گہرا ہوا کہ ایک روز جب شاہ نے صبح کو قلیان مانگا تو جواب ملا کہ "شرعی فتویٰ کے مطابق تمباکو کا آخری پتّہ تک ضائع کیا جا چکا ہے"۔

اسی دوران میں افغانی کو سلطان عبدالحمید خاں نے عزّت پاشا والیٔ بصرہ کی وساطت سے ترکی آنے کی دعوت دی۔ مگر ان پر اس وقت اصلاحِ ایران کی دھن سوار تھی۔ اس لیے وہ ترکی نہ گئے اور لندن پہنچ کر شہزادہ ملکم سابق سفیر ایران متعینہ لندن کی معیت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف اخبارات میں کئی مضامین ایران کے خلاف لکھے۔ مگر سب سے زیادہ توجّہ شاہزادہ ملکم کے اخبار "قانون" پر مرکوز رہی۔ پھر اپنا اخبار ضیاء الخافقین کے نام سے نکالا۔ جو عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ موجودہ سفیر ایران نے انہیں منانے اور ان کا جوش ٹھنڈا کرنے کی بہتیری کوششیں کیں اور کچھ نذرانہ بھی پیش کیا، مگر افغانی کب بخشنے والے تھے۔ جب اس طرح بھی اپنے ارادے

سے باز نہ آئے تو ایرانی سفارت خانے نے اس پریس پر دباؤ ڈلوایا جس میں ضیاء الخافقین چھپتا تھا کہ وہ اسے نہ چھاپا کرے۔

کچھ عرصے کے بعد ضیاء الخافقین بند ہو گیا۔ اور افغانی کی سرگرمیاں ایران کے متعلق بہت ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔ ضیاء الخافقین شعلہ بیانی میں اپنے پیش رو عروۃ الوثقیٰ سے کسی طرح کم نہ تھا، بلکہ اس کا لہجہ اس سے بھی کسی قدر سخت تھا۔ عروۃ الوثقیٰ میں ہدفِ ملامت دولِ یورپ تھیں اور ضیاء الخافقین کا رخ زیادہ تر شاہ ایران اور اس کے ملکی و غیر ملکی مشیروں کی طرف تھا۔ اس میں ایرانی علما اور عوام کو کبھی اجمالاً اور کبھی نام لے کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ اور ایران کی پستی اور تنزل کا نقشہ کھینچ کر بادشاہ کو معزول کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کے کئی اور خطوط و مضامین کا ماحصل یہ تھا کہ شاہِ ایران کو معزول کرنا اتنا بھی مشکل نہیں جتنا پاؤں سے جوتا اتارنا۔

سفرِ قسطنطنیہ اور اتحادِ اسلامی کی کوشش

سلطان عبد الحمید کا ایک اور دعوت نامہ آیا اور یاددہانی کے لئے دو تین تار بھی پہنچے جن میں کہا گیا تھا کہ فوراً ترکیہ پہنچ جائیں۔ شہزادہ ملکم خاں کے مشورے سے افغانیؒ ترکی جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں وہ قسطنطنیہ چلے گئے۔ اس وقت ترکی کا "مرد بیمار" اندرونی اور بیرونی روگوں میں مبتلا تھا۔ اندرونی طور پر وہاں لغاوتوں کے مواد پک رہے تھے اور بیرونی طور پر طاقتور حکومتیں آئے دن اس کے کسی نہ کسی حصے پر قبضہ کرتی رہتی تھیں۔ جمال الدینؒ اس سے پیشتر اتحادِ اسلامی کی کوششیں کر چکے

تھے۔ اور اس تحریک کے ایک داعی کی حیثیت سے ان کا نام تمام دنیائے اسلام میں کسی جگہ تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ چنانچہ انہیں ترکی بلانے سے سلطان کا یہ مقصد تھا کہ ان کے ذریعے سے دنیائے اسلام میں اتحادِ عالم اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرائی جائے۔ تاکہ خلافت کو بچانے کے لیئے اس تحریک کی پشت پناہی حاصل کی جا سکے۔ چنانچہ سلطان اور افغانی کے باہمی مشورے سے یہ طے ہُوا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا جائے جس کا اتحاد سر دست اتنا ہو کہ اگر کوئی حکومت کسی ایک کے خلاف دست اندازی کرے تو سب مل کر اس کا اقتصادی مقاطعہ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیئے ترکی میں مقیم تمام غیر ملکیوں کو بلا کر ایک جلسہ منعقد کیا گیا، پھر دنیائے اسلام کے اطراف و جوانب میں نمائندہ شخصیتوں کو تقریباً ۵۰۰ خطوط بھیجے گئے۔ اکثر مقامات سے ہمت افزا جوابات آئے۔ مگر ناصر الدین شاہ قاچار (شاہ ایران) کے لیئے یہ تجویز پریشانی کا باعث ہوئی۔ اس نے ترکی میں متعین ایرانی سفیر کو ہدایت کی کہ جمال الدین افغانی کے تمام ایرانی رفقا کو کسی طرح گرفتار کرا کے ایران بھیجدے۔ سفیر نے اپنے اعزاز و اکرام کے لالچ میں وزیر نظمیہ کو گانٹھ کر افغانی کے تمام ایرانی ساتھیوں کو گرفتار کرا دیا افغانی کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فوراً سلطان کے پاس پہنچے اور سمجھایا کہ یہی لوگ تو ہمارے ساتھ تحریک اتحاد اسلامی میں شریک ہیں اور انہی کو آپ نے گرفتار کرنے کا حکم جاری کرا دیا ہے سلطان نے قیدیوں کو واپس کرانا چاہا لیکن سفیر ایران نے کہا کہ سر دست اس حکم کی تنسیخ شاہِ ایران کی سخت توہین کے مرادف ہو گی۔ ہاں چند روز کے بعد

ان لوگوں کو واپس کرانے کی کوشش کی جائے گی مگر وہ وعدہ وفا نہ ہوا یہ لوگ حکومت ایران کے حوالے کر دیئے گئے اور حکومت نے انہیں قتل کرا دیا۔

اس حادثہ جانکاہ سے افغانیؒ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے تحریک اتحاد اسلامی میں دل چسپی لینی چھوڑ دی لیکن سلطان کی نظر میں ان کی قدر و منزلت اب بھی اسی طرح قائم تھی۔ وہ دربارِ خلافت میں بڑے بے تکلفانہ انداز سے آتے جاتے تھے۔ کسی رکاوٹ یا اطلاع کے بغیر سلطان سے ملاقات کر لینا، سلطانی تمغوں کو بلی کے گلے میں ڈال کر ان کی توہین کرنا وغیرہ اسی زمانے کے واقعات ہیں۔

۱۸۹۶ء تک یہ تعلقات اسی بے تکلفی سے قائم رہے۔ مگر اب چونکہ فریقین کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے سے بہت کم وابستہ رہ گئے تھے۔ اس لئے اس بے تکلفی میں زیادہ استواری باقی نہ رہ سکی۔ مخالفین کو ریشہ دوانیوں کا موقع مل گیا اور وہ افغانی سے سلطان کو بدظن کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

ترکیہ سے آنے کی اجازت نہیں ملی

۱۸۹۶ء میں مصر کے نوجوان خدیو عباس قسطنطنیہ آئے۔ افغانی روزانہ کاغذ خانہ کی سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہیں اتفاقاً خدیو بھی پہنچ گئے۔ اور پندرہ منٹ تک ان کی افغانی سے گفت و شنید ہوئی۔ مخالفین نے اس ملاقات کے بارے میں خوب خوب حاشیہ آرائیاں کیں۔ اور سلطان کو یہ بات ذہن نشین کرائی کہ افغانی خدیو سے سازش کر کے اسے خلیفہ بنانا چاہتے ہیں۔ سلطان نے اس بات کو صحیح سمجھا

اور افغانی پر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا اگرچہ بعد میں معاملات کی صفائی ہو گئی اور افغانی پر سے پہرہ اٹھا لیا گیا مگر دل کی کدورتیں رفع نہ ہو سکیں۔

اب افغانیؒ نے مناسب سمجھا کہ ترکی سے چلے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اجازت طلب کی، مگر سلطان اس کا نتیجہ شاہ ایران کے حق میں دیکھ چکے تھے۔ اور وہ اپنے ایک حریف کی زبان وقلم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینے کی غلطی نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے افغانیؒ کو باہر جانے کی اجازت نہ دی اور مجبور کیا کہ وہ وہیں نظربندی کی زندگی گزاریں۔

ناصرالدین شاہ قاچار کا قتل

ایرانی رفقا کے قتل سے افغانی کو جو صدمہ پہنچا تھا، وہ افغانی کے دل سے آخر وقت تک دور نہ ہو سکا۔ ترکی میں وہ اتحاد اسلامی کی تحریک سے دست کش ہو ہی چکے تھے۔ اب یہاں ان کے قیام کا مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ انقلاب ایران کے لئے ایک دور افتادہ مخلص کی حیثیت سے ممکن کوشش کرتے رہیں۔ چنانچہ وہ ترکی میں مقیم ایرانیوں کو لگاتار شاہ اور اس کے خلاف اکساتے رہے اور ایرانی علما اور رہنماؤں کو خطوط اور تار بھیجتے رہے۔ اس کا نتیجہ ان کی زندگی میں انقلاب ایران کی شکل میں تو نمودار نہ ہوا لیکن اسی سال شاہ ایران کو ایک انقلابی نے قتل کر دیا۔ ۱۶ رمئی ۱۸۹۶ء کو جب ناصرالدین شاہ قاچار اپنی سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں عبدالعظیم گیا تو درگاہ کے دروازے پر مرزا رضا خاں نامی ایک شخص نے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ قاتل کسی زمانے میں مظالم کا شکار ہو کر ایران سے ہجرت کر چکا تھا اور قسطنطنیہ آ کر افغانی کے

پاس کچھ دن مقیم رہا تھا۔ اور وہاں سے واپس آکر پھر اس واقعہ کا مرتکب ہوا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر یہ سمجھا گیا کہ ناصر الدین قاچار کا قتل افغانی کے ایما سے ہوا ہے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ خود مرزا رضا خاں نے گرفتاری کے بعد ایک مفصل بیان دیا تھا۔ جس سے افغانی پر اس واردات کا الزام لگانے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ تاہم یہ اعتراف اس نے بھی کیا تھا کہ اُن کی تقریروں سے ایران کے بارے میں وہ متاثر ضرور ہوا۔ اور یہ تقریریں اس واقعہ کے ارتکاب کے لئے کسی حد تک محرک ضرور ثابت ہوئیں۔

سفر آخرت

اس واقعہ سے سلطان ترکی کی نظر میں افغانی کی شخصیت اور بھی خوفناک بن گئی۔ سلطان ان کو ترکیہ سے باہر جانے کی اجازت نہ دینے کے فیصلے پر اور بھی سختی سے کاربند ہو گیا۔ ادھر افغانی کی تنقیدیں اس کے خلاف تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان اور افغانی کے تعلقات پھر بہت کشیدہ ہو گئے۔ بلنٹ اس وقت ان سے قسطنطنیہ جا کر ملا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں نے اس زمانے میں انہیں بہت افسردہ و ملول پایا۔ اسی نظر بندی اور افسردگی کی حالت میں انہیں سرطان کا عارضہ لاحق ہوا۔ ڈاکٹر عصمبیل کو ان کے علاج کے لئے مقرر کیا گیا۔ کچھ دانت نکالے گئے۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انہوں نے وائنا جانے کی اجازت طلب کی وہ بھی نہ مل سکی۔ آخر ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو ان کی روح نے بدنی تکالیف اور ذہنی آلام سے رہائی پائی۔ اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ اور

شیخ (مزار تی (قبرستان شیوخ) محلہ ماچقا میں دفن کیئے گئے۔

۲۲ سال تک ان کی قبر بے نام و نشان رہی۔ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں ایک امریکن سیاح مسٹر چارلیس کرین وسط ایشیا کی سیاحت کرتے ہوئے ترکی پہنچے۔ اور وہاں کے حالات کے تجسّس میں مصروف ہوئے۔ جمال الدین افغانی رح کے حالات سے بھی انہیں اسی دوران میں واقفیت ہوئی اور انہوں نے اپنے خرچ سے ان کی شاندار قبر تعمیر کرا دی۔

بعد میں شاہ افغانستان کی سعی سے ان کی لاش ترکیہ سے افغانستان لائی گئی۔ اور اب وہ وہیں مدفون ہیں۔

اتحاد

اتحادِ اسلامی

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ۔ اور اللہ اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج و اقبال میں مغرب اقصیٰ کے انتہائی نقطہ سے لے کر چین کی حدود میں تونکان تک اور شمال میں فاران سے لے کر خط استوا کے نیچے سراندیپ تک کرۂ ارضی کے نہایت طویل و عریض خطہ کو اپنے دائرۂ تصرّف میں لیا۔یہ ایک دوسرے سے متّصل اور ہمسایہ ممالک فرزندانِ اسلام کی اقامت گاہ کا کام تو اب بھی دے رہے ہیں مگر کسی زمانہ میں یہاں اس قوم کو ناقابلِ تسخیر شوکت و سطوت حاصل تھی۔ان کے جلیل القدر بادشاہوں نے حکومت کا چوگان ہاتھ میں لے کر تقریباً سارے کرۂ ارض کو اپنی ہیبت اور دبدبے کے محور پر گردش دی تھی۔ان کے لشکر کو کبھی شکست نہ ہوتی تھی ان کا عَلم کبھی سرنگوں نہ ہوتا تھا اور ان کی باتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ان کے قلعے، برج اور چھاؤنیاں ہر جگہ قائم تھیں۔ وادیوں اور میدانوں میں اور پہاڑوں کی ترائیوں میں ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے وسیع اور شاداب کھیت جا بجا لہلہاتے تھے اور انواع و اقسام کے

پھلوں اور پھولوں والے درخت بہارِ جاںفزا دکھلاتے تھے۔ ان کے شہر فنِ تعمیر کے بہترین اور مستحکم ترین قواعد کے مطابق بنائے گئے تھے اور وہ اپنی پیش کردہ عمدہ عمدہ دستکاریوں اور نئی نئی ایجادات پر نازاں تھے نہ صرف یہ بلکہ جن شہروں میں وہ رہتے بستے تھے ان میں بلند پایہ اربابِ علم وفن آباد تھے جو بجا طور پر آسمانِ فضیلت کے آفتاب وماہتاب اور فلکِ علم وہدایت کے درخشندہ ستارے کہلانے کے حق دار تھے۔

علومِ شرعیہ کا چرچا مسلمانوں کے ہر طبقہ میں گھر گھر تھا، اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں خود علومِ عقلیہ کا بھی یہ حال تھا کہ مشرق میں ابنِ سینا، فارابی اور رازی جیسے فیلسوف آسمانِ علم ودانش پر چمکے اور مغرب میں ابنِ ماجہ، ابنِ رشد اور ابنِ طفیل جیسے بلند پایہ حکیموں نے ساری دنیا سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ مشرق ومغرب کے درمیان باقی امصار وولایات میں بھی حکمت، طب، ہیئت، ہندسہ وغیرہ علوم وفنون کے ماہرین نے ایک غلغلہ بلند کر رکھا تھا۔

شوکت اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ عبّاسی خلیفہ کی زبان پر ایک تہدید آمیز کلمہ کے آتے ہی فغفورِ چین تک کا سر جھک جاتا اور یورپ کا عظیم ترین بادشاہ بھی لرزہ براندام ہو جاتا۔ انہی میں محمود غزنوی۔ ملک شاہ سلجوقی اور صلاح الدّین ایوبی جیسے فاتح بھی گزرے جو قرونِ متوسّطہ کی کتابِ تاریخ میں عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشرق میں امیر تیمور گورگان اور مغرب میں سلطان محمد فاتح

سلطان سلیم اور سلطان سلیمان عثمانی جیسے بارعب شہنشاہوں کے طنطنے اب تک گونج رہے ہیں - یہ لوگ اپنی زندگیاں ختم کر چکے مگر زمانہ انہیں بھلا نہیں سکا اور نہ صفحۂ ہستی سے ان کے آثار کو مٹا سکا ہے مسلمانوں کے ناقابلِ تسخیر بیڑے بحر ابیض، بحرِ احمر اور بحر ہند میں اقتدار و تصرّف کے واحد مالک رہے ہیں اور ابھی کل کا ذکر ہے کہ ان سمندروں میں انہیں ایک امتیازِ خاص حاصل تھا - ان کے مخالف نہ صرف ان کی قوّت و سطوت کے سامنے عاجز تھے بلکہ ان کے علم وفضل سے بھی مرعوب و متاثر تھے -

آج بھی مسلمان وہی ہیں - یہ ممالک اور اوطان جو ان کو اپنے متقدّمین سے وراثت میں ملے ہیں - ان کے وجود سے معمور ہیں ان کا شمار ۲۰ کروڑ سے کسی حالت میں کم نہیں - ان کے دلوں میں دینی عقائد کا بے پناہ جوش و خروش موجود ہے - اس لئے ہر خطّے کے مسلمان اپنے ہمسایہ ممالک کے باشندوں کی بہ نسبت زیادہ دلیر، نڈر اور جاں نثار ہیں - انہی عقائد کی بنا پر وہ دنیوی زندگی اور اس کے دلفریب شان و شکوہ کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے - قرآن کریم نے ان کے سامنے اپنی محکم آیات پیش کیں اور ان سے مطالبہ کیا کہ اپنے عقائد کو حجّت اور برہان کی روشنی میں پرکھ لیں - اور ظنون و اوہام کے گورکھ دھندوں سے نجات حاصل کریں - قرآن کریم ہی نے انہیں انسانی فضائل اور بہترین حکیمانہ اوصاف سے متصف ہونے کی تعلیم دے کر ان میں فضیلت و شرف کا احساس پیدا کیا - اسی وجہ سے ان

کی عقلیں روشن اور اذہان سب سے زیادہ بیدار ہیں۔ کسب کمالات کے لئے
ان کی استعداد بہت قوی اور توانا ہے ان کی طبیعتیں اخلاقی اقدار اور سلامت
روی کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ شرافت کو اپنی اور
صرف اپنی واحد ملکیت سمجھتے ہیں - ان کی سچی کتاب ان سے وعدہ کرتی ہے
کہ باطل کی ساری معرکہ آرائیوں کے باوجود اللہ تعالےٰ ان کی شان کو بلند و بالا
ہی رکھے گا۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنے اوپر کسی غیر کی سطوت و سلطنت برداشت
نہیں کر سکتے۔ کسی غیر مسلم طاقت کو نبرد آزمائی اور زر افشانی کے کتنے ہی کرتب
کیوں نہ یاد ہوں کسی مسلمان کے تصوّر میں بھی یہ نہیں آسکتا کہ وہ کبھی اس کے
سامنے سپر انداز ہو گا۔ عقائد کے مضبوط رشتے نے ان کے درمیان وہ پائیدار
اتحاد اور اخوت پیدا کر رکھی ہے کہ بنجۂ اغیار میں کسی مسلمان کے گرفتار ہونے
کو باقی تمام مسلمان اپنی قید اور اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں - یہ احساس
ان کے وجدان میں شامل ہے، اور کوئی بہلاوا، کوئی فریب اسے ان کے
دلوں سے نہیں مٹا سکتا۔

ان کا دین انہیں علوم و معارف کی ترغیب دیتا ہے اور ان سے عشق
و محبّت کرنا سکھاتا ہے۔ اپنے دورِ اقتدار کے شباب میں انہوں نے علوم و
فنون کی نعمت کا شاندار حصّہ حاصل کیا اور اب بھی وہ اپنے کو دوسروں کی بہ
نسبت میراثِ علم و فضل کا زیادہ حقدار سمجھتے ہیں۔

ماضی کی یہ شاندار روایات اور موجودہ قابلِ تعریف اوصاف دونوں آپ سن چکے۔ مگر اس کے باوجود یہ افسوس کے ساتھ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اب ان کی حالت وہ نہیں جو پہلے تھی۔ وہ علوم و معارف اور فنون و صناعات میں کبھی سارے عالم کے استاد مانے جاتے تھے۔ مگر اب دوسروں سے بہت پیچھے اور ان کے دست نگر ہیں۔ ان کے دین و مذہب کا مطالبہ یہ ہے کہ دشمن کے قبضہ اقتدار کے سامنے کبھی سر نہ جھکاؤ اجنبی تسلّط کو ہٹا کر اپنے شہروں اور علاقوں کو اس کے تصرّف سے آزاد کراؤ اور اس مقصد کے لیے ہر طاقت کا پوری قوّت سے مقابلہ کرو۔ بلکہ صحیح معنی میں اسلام کا رکن اعظم یہی ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آج اسلامی ممالک کے کنارے روز بروز کٹتے جا رہے ہیں اور ان کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا مسلمان خدا کا یہ وعدہ بھول گئے کہ وہ اس کے نیک بندے رہ کر زمین کے وارث بنیں گے؟ کیا وہ اس حقیقت سے غافل ہو گئے کہ خدا نے انہیں مجرمین و متمرّدین کی خواہشات کے برعکس ہر مخالف طاقت پر غالب رکھنے اور ایک باعزّت قوم بنانے کی ذمہ داری لی ہے؟ کیا یہ بات ان کے حافظہ سے اُتر گئی کہ اللہ تعالیٰ نے جنت انہی کے لئے مخصوص کی ہے اور اس کے بدلے میں ان کے جان و مال صرف اس لئے خریدے ہیں کہ حق کا کلمہ بلند کر کے دنیا میں پھیلائیں؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلامی عقائد ان کے دلوں میں گھر کر چکے ہیں۔

ان کے ارادے انہی عقائد کے تابع فرماں ہیں۔ عقائد دینیہ پر یقین رکھنے اور فضائل شرعیہ کو حاصل کرنے کی رغبت عوام و خواص میں یکساں موجود ہے یہ ترقی علوم کا رُک جانا اور ملی روح کی قوت میں ضعف کا پیدا ہو جانا بے سبب نہیں۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن میں سب سے اہم سلطنت کے طلب گاروں کا باہمی اختلاف ہے۔ مسلمانوں کی کوئی علیحدہ قومیت اور تقسیم نہیں وہ صرف ایک ہی قومیت رکھتے ہیں اور وہ ہے اسلام ان میں بادشاہوں اور ارباب اقتدار کے تعدد کی وہی حیثیت ہے جو قبیلہ میں متعدد رئیسوں یا ایک جنس کے افراد میں کئی سرداروں کی ہوتی ہے لیکن ان بادشاہوں کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے کی ضد ہوتے گئے انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزمائیاں کر کے جمہوری فکروں کو اپنی تماش بینی میں محو کر لیا ہر ایک خود غالب آنے اور دوسرے کو مغلوب کرنے کے اسباب فراہم کرنے کی دھن میں لگ گیا۔ عوام کو حقیقتِ حال سے غافل رکھتا رہا۔ ان ہنگاموں اور داخلی تنازعوں میں پھنس کر انہوں نے ان علوم کا کھوج لگانے میں کوتاہی کی جو ابھی تک ان کے حیطۂ معلومات سے باہر تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ حاصل کردہ علوم و فنون کی ترقی سے غافل رہ کر انہیں بھی آہستہ آہستہ طاقِ نسیاں کی نذر کر بیٹھے۔ ان حالات میں غربت و افلاس کا آنا اور ملی قوت میں ضعف اور اجتماعی نظام میں کمزوریوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ امراء و سلاطین

کے باہمی تنازعات نے ملتِ اسلامیہ میں اختلاف وافتراق اور تشتت و انتشار کے بیج بوئے۔ یہ امراء وسلاطین آپس کے جھگڑوں میں مصروف ہوئے اور اغیار کو مسلمانوں پر دست درازی کرنے اور ان کے حقوق کو پامال کرنے کا موقع مل گیا۔

امراء وسلاطین میں داخلی جھگڑوں اور باہمی قتل وقتال کی یہ بدترین عادات اس وقت پھیلی ہوئی تھیں جب ان کا مقابلہ کرنے والی کوئی دوسری غیر اسلامی طاقت روئے زمین پر موجود نہ تھی۔ وہ خود ہی ایک دوسرے کے مقابلے پر آکر اپنے زور اور طاقت کو آزمانے لگے۔ زمانہ گزرتا گیا اور امراض باطنی کی جڑیں ان کے دلوں میں زیادہ گہرائی کے ساتھ پیوست ہوتی گئیں۔ حرص وآز کی بندگی ان کے مزاجوں میں رچ گئی۔ خواہشات کی پیروی میں وہ صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے اور سلطنت وامارت کی ظاہری شان وشوکت کے نشے میں مست ہو کر مدتوں تکبّر اور خود آرائی کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہے۔ آخر کار ان کی اولوالعزمی کی عظیم الشان روایات ختم ہوگئیں اور ناز ونعم کی زندگی اور عیش وعشرت کے غلط معیار کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ انہوں نے اپنے ہم مذہب بھائیوں کے مقابلہ میں دوسروں سے التجائیں کیں اور انہیں امداد کے لئے پکارا۔

اسی روش نے اندلس کے مسلمانوں کا خاتمہ کیا اور اسی نے ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیادیں متزلزل کر ڈالیں جس کے کھنڈروں پر آج انگریزوں

نے اپنی حکومت کی مضبوط عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔ احمقوں اور بیوقوفوں
نے اپنے نفسانی اغراض اور ناپاک آرزوؤں کے منصوبوں کو کامیاب بنانے
کے لئے بلادِ اسلامیہ کو ضعف و انحطاط کے عمیق غاروں کی طرف دھکیل دیا۔
قابلِ مذمت ہیں ان کے افعال اور پست ترین ہیں ان کے اعمال۔ یہی وہ
لذتوں میں منہمک ہونے اور خواہشات کی دنیا میں بے خبر سونے والے
لوگ تھے جنہوں نے ملّت کے اتّفاق و اتّحاد کو تباہ و برباد کیا۔ اس کی
شوکت و عظمت کو پامال کر ڈالا اور علوم و فنون کی ترقی روک دی۔ صنّاعوں
تاجروں اور کاشتکاروں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر صنعت۔ تجارت اور
زراعت جیسے مفید شعبوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ دنیا کے بڑھتے ہوئے
لالچ اور اشیائے خسیسہ کی بے پناہ خواہش کا بُرا ہو کہ ان کی بدولت مسلمانوں کو
شدید ترین مضرتوں اور بدترین نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے
کلام کو پسِ پشت ڈال کر اس کے ایک عظیم المرتبت حکم سے سرتابی کی۔ دشمن
ان کے دروازوں پر اپنا لاؤ لشکر لئے کھڑا تھا اور وہ آپس کی لڑائی میں مصروف
تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کا فرض یہ تھا کہ ایک اسلام کے رشتے میں باہم متحد
ہو جاتے اور دشمن کے حملوں کی مدافعت کرتے اپنے روزمرّہ جھگڑوں میں تو وہ
اس کے بعد بھی دوبارہ مشغول ہو سکتے تھے۔ طمع کی انتہا تک پہنچنے اور دنیوی
خرافات میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے سے دائمی حسرت و ارمان، موت

کے بعد نہ مٹنے والی بدنامی اور ابدی بدبختی و حرماں کے سوا انہیں کیا ملا؟

ہاں، حق کی عزت کی قسم! عدل و انصاف کے راز کی قسم! اگر مسلمانوں کو علمائے باعمل کی نگرانی میں اپنے راسخ عقائد اور اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ان کی روحیں متحد اور افراد ایک دوسرے کی الفت سے سرشار ہو جاتے۔ لیکن ہائے افسوس ان کے متاعِ امن کو ان مفسدوں نے برباد کیا جن کی نظر میں سعادت کا بلند معیار یہیں تک تھا کہ انہیں جاگیردار یا نواب کے خطاب سے نواز دیا جائے خواہ یہ جاگیر ایسی ہی کیوں نہ ہو جس میں تغیر و تبدل اور بست و کشاد کا کوئی اختیار انہیں حاصل نہ ہو۔ انہی لوگوں نے مسلمانوں کو ان ممالک سے محروم کیا جو خدائے تعالیٰ نے ان کے قبضۂ اقتدار میں دے رکھے تھے ان ہی نے ان میں وہ زہر پھیلایا کہ وہ اپنے ہی بادشاہوں اور اپنے ہی خلفاء کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کرنے لگے اور ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے۔

حکومت اسلامیہ کے قیام و استحکام کے لئے اتفاق پر ایمان رکھنے کی ضرورت اتنی بدیہی ہے کہ اسے سیکھنے سکھانے کے لئے نہ کسی معلّم کی ضرورت ہے اور نہ کسی تفصیل و توضیح کرنے والی کتاب یا کثیر الاشاعت رسالے کی حاجت! لکھے پڑھے افراد کو جانے دیجئے۔ معمولی سمجھ بوجھ کے مسلمان بھی جب مسلمانوں کے اختلافات اور اغراض و مفادات کے تصادم کی خبریں سنتے اور ان کے ملّی مصائب کا مطالعہ کرتے ہیں تو شدّتِ غم میں سرد آہیں بھرتے اور آٹھ آٹھ

آنسو رو تے ہیں ۔ اے کاش ! یہ گمراہ جاگیردار اور نواب، یہ وقار اور عزت کے لالچ میں ڈوبے ہوئے انسان مسلمانوں میں پیدا ہی نہ ہوتے ۔ اس وقت مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک مسلمان آپس میں متحد ہو جاتے اور سب کے سب ایک اسلامی آواز اور متحدہ اعلان پر لبیک کہتے ہوئے ایک مرکز پر آجاتے ۔

مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے تین اصولی چیزوں کی ضرورت ہے ۔

۱۔ ان تدابیر کو اچھی طرح سمجھ لینا جن کے ذریعہ خطرات کی مدافعت کی جا سکتی ہے ۔

۲۔ خطرات پیش آتے ہی ان کی مدافعت میں ہمہ تن مشغول ہونا اور اس مہم میں اتفاق رائے سے کام لینا ۔

۳۔ آنے والے خطرات کا حقیقی احساس کر کے ایک دوسرے کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنا اور اخوت کے رشتہ میں منسلک ہو جانا ۔

روسیوں کو دیکھئے ان میں آپ کو ان تین اصولوں سے زیادہ کچھ نہیں ملیگا ۔ علوم و فنون اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے وہ یورپ کی کئی اقوام سے بہت پیچھے ہیں ۔ ان کی مملکت میں دولت و ثروت کے وسیع ذرائع بھی موجود نہیں دولت و ثروت کے ذرائع موجود بھی ہوں تو صنعت و حرفت کی وہ رَو اور سرگرمی نہیں جو ان دولتوں کو کام میں لا کر قومی ترقی کا معیار بلند کرنے کے لئے ضروری ہے ۔ اسی وجہ

سے روس تنگدستی اور افلاس کے بڑے صبر آزما دور سے گزر رہا ہے لیکن ان ساری کمزوریوں کے باوجود قومی دفاع کی تدابیر سے عوام کی آگاہی ان تدابیر کی بجا آوری میں ان کا باہمی اتفاق و اتحاد ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور یہی درحقیقت وہ زرّین اصول ہے جس کی وجہ سے روسی شہنشاہیت کی دھاک تمام روئے زمین پر بیٹھی ہوئی ہے۔ چٹانوں کی طرح مضبوط یورپین حکومتیں روسی خطرہ کے تصوّر سے کانپتی ہیں۔ بے شک روسیوں کے پاس اسلحہ تیار کرنے کے لئے زیادہ وسائل، اور کارخانے موجود نہ تھے۔ لیکن انہیں آلاتِ حرب کے مہیا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کی فوجی تنظیم بھی اپنی ہمسایہ حکومتوں جتنی مکمل نہ تھی لیکن انہوں نے اپنے عساکر کو منظم اور تربیت یافتہ بنانے کے لئے دوسری قوموں سے ماہر فوجی افسر مانگنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ اور آج ان کی فوجیں اتنی مضبوط ہیں کہ ان کی شوکت و صولت کا خوف اقوامِ یورپ پر ہردم سوار رہتا ہے۔

پھر ہمیں کس چیز نے دوسروں کی پیروی سے روک کر بے دست و پا کر دیا ہے۔ کس نے ان باتوں کی تقلید کو منع کر دیا ہے جن کا عمل میں لانا ہمارے لئے سب سے زیادہ آسان ہے۔ جن کی طرف ابھی تک ہمارے دلوں میں طبعی میلان موجود ہے اور سب لوگوں سے زیادہ شدید ہے۔ قومی عزت کی نگہداشت، اس میں رخنہ اندازی کرنے والے حوادث سے متاثر ہونا۔ وحدت

اجتماعیہ کے قلعہ کو مضبوط و محفوظ رکھنے کے لئے ہر اس عمل کے خلاف متحدہ اقدام جو اس کی مستحکم فصیل کو توڑ سکے، ہمارا اولین فرض ہے ہماری ہمتوں کو پست کرنے اور قوی حس کو عمل سے روکنے کے ذمہ دار وہ شراب کے متوالے ہیں جو لذیذ غذاؤں، نرم نرم ریشمی بستروں، فلک پیما عمارتوں، خدمت گزاروں اور حاشیہ نشینوں کے انبوہ کثیر کے شوق میں فکر فردا سے بالکل بے نیاز ہو بیٹھے ہیں وہ جشنوں اور تقریبات کے موقع پر بڑی بڑی مجلسیں قائم کرکے صدر نشین بنتے ہیں جھوم جھوم کر سر ہلاتے اور شانوں کو حرکت دیتے ہیں۔ اور یوں اپنی شان و شوکت کا اظہار کرکے سرکاری کاغذات میں وہ نئے القاب درج کرلیتے ہیں جن کے مسمّی کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ اخلاق سے گرے ہوئے لوگ ان بوسیدہ رسوم کے وہمی تخیل میں محو ہوکر کسی گراوٹ کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں دشمنوں کی ایسی ایسی ریشہ دوانیوں کو برداشت کرلیتے ہیں۔ جنہیں کوئی غیرت مند انسان موت کی حد تک پہنچے بغیر برداشت نہیں کرسکتا۔ ہاں یہی لوگ مسلمانوں کی گردنوں کے طوق اور پاؤں کی بیڑیاں بنے ہوئے ہیں۔ انہی لوگوں نے ان شیروں کو (مسلمانوں کو) اپنے شکار سے روکا اور خود اس شکار کو لومڑیوں کی طرح لقمہ دہن بنا گئے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

اے بہادروں کی یادگار مردو! اے سورماؤں کے جانشینو! اے مردوں

کے وارثو! کیا تمہارے اقبال کا دور بالکل ختم ہو چکا ہے؟ کیا تلافئ مافات کا موقعہ ہاتھ سے نکل چکا ہے؟ کیا نا امیدی کی گھڑی سر پر آگئی ہے؟ نہیں نہیں! معاذ اللہ! زمانہ کبھی تم سے نا امید نہیں ہو سکتا، اور نہ سے پشاور تک جو اسلامی مملکتیں پھیلی ہوئی ہیں ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے متصل ہیں اور وہ قرآنی دستور کی ایک اجتماعی وحدت میں منسلک ہیں۔ تعداد میں ان کے باشندے ۲۰ کروڑ سے کسی طرح کم نہیں۔ شجاعت اور بہادری میں وہ سب زمانوں اور سب قوموں میں ممتاز ہوتے چلے آئے ہیں۔ پھر کیا یہ ان کا کام نہیں کہ وہ بھی دیگر اقوام کی طرح یکدل، ایک زبان ہو کر اعدا کی مدافعت اور ناموس قومی کے وقار کے لئے آپس میں اتفاق کر لیں۔ اگر انہوں نے ایسا کر لیا تو یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہوگا کیونکہ اتفاق ان کے اصول دینی کا اہم رکن ہے۔ کیا ان کے حواس سُن ہو گئے اور ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا ہر بھائی دوسرے ابنائے نوع کی طرف کتنی باتوں میں محتاج ہے؟ کیا ان میں سے ہر ایک کا یہ فرض نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کی روشنی میں دیکھے اور اتحاد و اتفاق کی ایک مضبوط چٹان کھڑی کر کے ان سیلابوں کا رخ پھیر دے —— جو اس وقت ہر طرف سے قوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔

ان باتوں سے میرا مقصد یہ نہیں کہ ان تمام ممالک میں کسی شخص واحد

کی حکمرانی تسلیم کی جائے کیونکہ ممکن ہے کہ اس بات کو بہت مشکل سمجھا جائے۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ان سب پر قرآن کا حکم غالب رہے اور سب مذہب اسلام کو اپنے اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بنالیں۔ ہر صاحب مملکت اپنے ملک کی نگہبانی کرتے ہوئے اپنے ہمسایوں کی حفاظت میں پوری طرح کوشاں رہے کیونکہ اس کی زندگی ہمسایہ مملکت کی زندگی سے وابستہ اور اس کی بقا ہمسایہ کی بقا کے بغیر ناممکن ہے

یہ اتحاد و اتفاق موجودہ اوقات میں اور بھی زیادہ اہم ہوگیا ہے۔ ضرورت اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ باہم ایک ہو جاؤ۔ یاد رکھو یہی اتفاق کا وقت ہے یاد رکھو زمانہ مہلت دے دے کر تمہیں ممنون کر رہا ہے۔ ان مہلتوں اور فرصتوں کو غنیمت سمجھو ان سے فائدہ اٹھانے میں ذرا سستی نہ دکھاؤ۔ رونے پیٹنے سے مردے زندہ نہیں ہوتے۔ افسوس کرنے سے گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ رنج و ملال میں پڑے رہنے سے مصیبت نہیں ٹلتی۔ کامیابی کی کنجی حرکت اور عمل میں ہے۔ صداقت اور راست بازی کامیابی کا زینہ ہے۔ ڈر اور خوف ناامیدی اور پست ہمتی کو قریب تر لاتے ہیں اور ناامیدی اور پست ہمتی موت کا سبب بنتی ہے۔ وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهٗ وَالْمُؤْمِنُونَ ۝ ثُمَّ تُرَدُّونَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (اور ان سے کہہ دو کہ تم (جو چاہو) کرو۔ بہت جلد خدا اور اس کا رسول اور مومنین تمہارے اعمال کا جائزہ لیں گے۔ پھر تم خدا کے سامنے جو ہر ظاہر و پوشیدہ کا عالم ہے، پیش کئے جاؤ گے جو تمہیں ان اعمال کی خبر دے گا جو تم نے کئے تھے۔)

خبردار! تم اس مخلوق میں شمار کئے جانے کی کوشش نہ کرو جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے فتح کا علم دینا پسند نہیں فرمایا اور جنہیں اُلٹے پیروں پیچھے ہٹا کر یہ آواز دی گئی کہ جہاد سے جی چرانے والوں میں شامل ہو کر بیٹھے رہو۔ اللہ تعالیٰ منافقوں کے بارے میں فرماتے ہیں۔ رَضُوا بِاَنۡ یَّکُوۡنُوۡا مَعَ الۡخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ فَہُمۡ لَا یَفۡقَہُوۡنَ ۔ (وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ناپسند کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے سو وہ سمجھتے نہیں۔)

یاد رکھو! قرآن زندہ کتاب ہے کبھی نہیں مٹے گی جسے قرآنی محامد کا کچھ حصّہ ملیگا وہ محمود اور قابلِ تعریف ہے اور جو قرآنی حقائق کی روشنی میں کسی درجہ میں بھی مستحقِ غضب ہوگا۔ وہی دراصل مغضوب اور گمراہ ہے۔ خدا کی کتاب ابھی منسوخ نہیں ہوئی۔ اس کی طرف لوٹ آؤ! اور اپنے حالات اور طبیعت کو اسی کی گرفت میں دے دو۔ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۔

ہمارے خیال میں مسلمان والیانِ ملک، اپنے "اعمال صالحہ" کا انجام دیکھ کر کچھ عبرت حاصل کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان سے پیشتر واجبات عمل میں کوتاہی کرنے والے بزرگوں پر جو مصائب آئے تھے ان کا اعادہ ہونے سے پہلے وہ اپنی کمزور حالت کو سنوار لیں اور قومی ترقی کے لئے زمین ہموار کریں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اتحاد کی طرف بلانے والی اور خوابِ غفلت سے یکایک بیدار کرنے والی پہلی پکار اس شخص کے قلم اور زبان سے نکلے گی جو مرتبے میں ان سب سے بلند

اور شوکت و سطوت میں سب سے قوی ہے اور ہمیں اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ باعمل علمائے دین اس شریف اور نیک کام کو سرانجام دینے میں بیش از بیش حصہ لیں گے۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ وَلِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔

اتحاد اور سیادت

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشدّ بعضہ بعضاً (مومن اور مومن کی مثال عمارت کی طرح ہے جس کے اجزا ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں)

اتحاد اور سیادت دونوں امر قومی اور اجتماعی زندگی میں اہم ترین درجہ رکھتے ہیں اور ان کے حصول میں کبھی تو فطری ضرورتیں اور طبعی تقاضے امداد دیتے ہیں۔ کبھی مذہب ان سے متمتع ہونے کے راستے سجھا دیتا ہے اور کبھی تربیت و تہذیب اور تمدن و ثقافت کی ممارست سے یہ درجاتِ عالیہ میسر آتے ہیں۔ اتحاد اور سیادت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک ساتھ بڑھتے اور پروان چڑھتے ہیں ایک کے حاصل ہو جانے پر دوسرے کا مل جانا قدرتاً لازم ہے۔ قوم کے افراد کو باہم منظم کرنے والی وحدت کی طرف میلان اور کسی حالت میں کمزور نہ ہو سکنے والی سیادت کا شغف ان دونوں اوصاف کے مجموعہ سے اُمتیں نمو حاصل کرتیں عظمت و رفعت سے بہرہ اندوز ہوتیں اور ترقی و سربلندی کے مدارج طے کرتی ہیں جب مشیئت ایزدی کسی قوم کی تعمیری زندگی کی بنیاد رکھنے اور اس کے سقف و دیوار کو مضبوطی سے استوار کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو اس کے اینٹ گارے میں ان جلیل القدر

اوصاف کا خمیر شامل کر کے اُسے ایک منظم اور شاندار ہیئت عطا کر دیتی ہے اور پھر انہی اوصاف کے مطابق اس کی حیاتِ اجتماعی کو ایک مقرر و معین وقت کی حدوں میں جکڑ دیتی ہے۔

جو قوم اپنے نشو و نما اور قیام و استحکام کے لئے دوسری قوموں کی طرف ہاتھ بڑھا کر ان سے ساز و سامان حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گی وہ کسی نہ کسی دن مخالف طاقتوں کے دندانِ آز کا شکار ہو کر ملیامیٹ ہو جائے گی۔ اس کے آثارِ حیات مضمحل ہو جائیں گے۔ اور صفحۂ ہستی سے اس کا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ اجتماعی زندگی میں اقتدار و سیادت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو جسمانی زندگی کے قیام و بقا کے لئے غذا اور پانی کو جس طرح غذا کی نامناسب کمی سے جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے اور انسان کمزور اور لاغر ہو کر بالآخر لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی قوم بھی تنازع للبقا کے میدان میں دوسری قوموں کے دوش بدوش جد و جہد کئے بغیر اپنی زندگی قائم نہیں رکھ سکتی۔ مگر کسی قوم کے لئے اپنے نظام کی حفاظت اور اپنی نشو و نما کی خاطر اقتدار کے وسائل حاصل کرنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک وہ اپنی ہیئت اجتماعی کی ضروریات فراہم کرنے کے لئے باہم متفق و متحد نہ ہو۔ جب کسی قوم میں اتحاد و اتفاق کے آغاز نمودار ہوتے نظر آئیں تو سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بلند ترین سیادت اور پراگندہ قوموں پر اقتدار کے انعامات محفوظ کر رکھے ہیں۔ تاریخ کے صفحات پلٹ کر دیکھئے اور مختلف شعوب و قبائل کی داستانِ زندگی کا کھوج لگا کر

اِن کے ابتدائی اور انتہائی حالات کا غور سے مطالعہ کیجئے۔ آپ کو اللہ تعالےٰ کا یہ قانون ہر جگہ جاری وساری نظر آئے گا۔ کسی قوم میں اتحاد کا پایہ جتنا مضبوط ہوگا اتنی ہی وہ زندگی کے دوام واستحکام سے زیادہ متمتّع ہو سکے گی۔ اسی طرح اس کی عظمت وسربلندی کا معیار یہ ہے کہ وہ اقتدار وسیادت کے حصول کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ دست وگریباں رہے۔ اس کا ستارہ نقطۂ عروج سے اسی وقت مائل بہ زوال ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے باپ دادا کی کمائی ہوئی میراث کے ساتھ لہو ولعب میں مشغول ہو جاتی ہے۔ خود نانِ جوین پر قانع ہو جاتی ہے اور اپنے ممالک کے دروازوں پر اُس مسافر کے انتظار میں چشم براہ ہوتی ہے جو بُرے ارادے لے کر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جب کبھی کسی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹایا ہے تو اُسے اختلاف وافتراق اور تشتّت وانتشار کے طویل اور مہیب عذاب میں گرفتار کیا ہے اور پھر اس کی کتابِ زندگی کا آخری ورق درس گاہِ روزگار میں اُلٹ دیا ہے۔

"اتفاق" ایک دوسرے کے ساتھ تعلّقات قائم کرنے اور ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کا نام ہے اور یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہر فرد کو قوم کے سود وزیاں کا احساس ہونے لگے۔ قوم کے تمام طبقوں کا ایک ایک رُکن اس اقتدار اور غلبہ کی اہمیت سے آگاہ ہو جائے جو اتحاد واتفاق کے ذریعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور اس میں وہی لذت محسوس کرنے لگے جو وہ دنیا کی کسی اور مرغوب ترین چیز میں محسوس کر سکتا ہے۔ اسے ان بیش قیمت فضائل کی قدر وقیمت معلوم ہو

جو اتفاق کے نہ ہونے سے چھن چکے ہیں اور نا اتفاقی میں ایسی ہی تکلیف محسوس ہونے لگے جیسی کسی اور بڑی سے بڑی مصیبت میں ہو سکتی ہے۔ جس شخص میں یہ احساس موجود ہے وہی قومی مسائل پر غور و خوض کرے گا وہی اپنے ذاتی اور انفرادی مسائل کے بجائے قومی مسائل کو زیادہ اہمیت دے گا۔ اور وہی اپنے اوقاتِ عزیز کا معتد بہ حصہ اُن تدابیر کی تلاش میں صرف کرے گا۔ جو شر اور ہلاکت کے گڑھے کی طرف دھکیلنے والے خطرات کو ٹال سکیں۔ یقیناً یہ ایسا غور و فکر نہ ہو گا جو تخیل کی دیواروں میں محصور اور نتائج عمل پیدا کرنے سے عاری ہو، بلکہ یہ ایک عمیق بصیرت اور ایک ایسا پختہ یقین ہو گا جس کے بعد مصمم ارادے اور جوش عمل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہی غور و فکر سوچی ہوئی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے جد و جہد کی وہ روح پیدا کرتا ہے جو اسباب معیشت کے حصول کے لئے ضروری ہے جن افراد کو اتحاد و اتفاق کی قدر و قیمت معلوم ہے وہ قومی کاموں کو اپنے گھریلو کاموں پر مقدم رکھیں گے اور مصالح و منافع کے حصول اور مفاسد کے ازالہ کے لئے صرف موجودہ وسائل پر ہی اکتفا کر کے نہیں بیٹھ جائیں گے بلکہ غور و فکر کی نئی نئی راہیں اختیار کر کے ہمت اور عزم کی تلواریں نیاموں سے نکالیں گے۔ اور اپنی سعی اور جد و جہد کے ذریعہ بہت سی ان طاقتوں اور قوتوں کو بھی اپنے تابع کر لیں گے جو اب تک ان کی دسترس سے باہر رہی ہیں۔ تاکہ ان کے ذریعے دولت و ثروت کے مخفی خزانے نکال کر قومی سرمایہ میں شامل کریں۔ اور ملت کی حفاظت کے لئے مناسب سامان تیار کریں۔

جس سے وہ اپنی عمرِ طبعی کی انتہا تک بخیر و خوبی پہنچ سکے۔ انسان کی انفرادی زندگی میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دور اندیش شخص اپنی معیشت کے لئے زیادہ سے زیادہ لوازم جمع کرنے اور اپنی متوقع زندگی تک ضروریات کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے جہد بلیغ کرتا ہو اور اپنے بعد اپنی اولاد کے گزار کے لئے کافی جائداد چھوڑنے کی فکر کرے۔

قوموں کی زندگی کا پہلا دور کم از کم پانچ پشتوں تک رہتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے دَور آتے ہیں۔ پہلے دَور کو جو باقی سب دَوروں سے مختصر ہوتا ہے سنِ طفولیت سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد دورِ کمال کی ابتدا ہوتی ہے اور ہوش مند قوموں کی ہمتیں اس کمال کو اعلےٰ سے اعلےٰ شکل میں ظاہر کرتی ہیں۔

جب قوموں کے افراد میں احساس کی تیزی اور فراوانی اس حد تک پیدا ہو جاتی ہے تو عوام و خواص بلند ہمتوں اونچے اخلاق رہبری کے اوصاف اور بہترین عزائم سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کو قومی سیادت و اقتدار کی لگن ہوتی ہے اور سب متحد ہو کر اپنے حریفوں پر غالب آنے کے لئے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ سیلاب کی طرح سب طرف چھا جاتے ہیں اور اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک اپنے مقاصد کی آخری سرحد پر کامیابی کا علَم نہ لہرا دیں۔ پہلی ہی یلغار کے بعد انہیں آگے بڑھنے کے لئے نئی فکر اور نئی تدابیر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کی طبیعت اس طرف خود بخود قدم بڑھاتی رہتی ہے۔

اتحاد اور سیادت دین اسلام کے قصر رفیع کے دو بنیادی ستون ہیں۔ ان کی بجاآوری کے لئے جدوجہد کرنا اسلام سے وابستگی رکھنے والے ہر شخص پر فرض ہے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق عائد کر دیئے ہیں، اگر کوئی مسلمان ان سے پہلو تہی کرے تو اُسے دُنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً۔ (ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کے مثل ہوتا ہے جس کے اجزا ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں۔

اور یہ کہ ہر مومن دوسرے مومن کے لئے اعضا کی طرح ہے جس طرح ایک عضو کو تکلیف پہنچنے کی صورت میں سارے اعضا بے چینی اور بے قراری سے دوچار ہو جاتے ہیں اسی طرح ایک مومن دوسرے کی تکلیف سے بے چین ہو جاتا ہے آپ نے مسلمانوں کو الفت اور باہمی اتحاد کا رشتہ توڑنے کو سختی سے منع فرمایا تھا۔

لاتقاطعوا ولاتدابروا ولاتحاسدوا وکونوا عباد اللہ اخوانا

(آپس میں تعلقات مت توڑو۔ ایک دوسرے کی طرف پشت مت کرو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ اور تم خدا کے بندے آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ)

جو لوگ جماعت کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی مثال آپ نے اس بکری سے دی جو اپنے ریوڑ کو چھوڑ کر دور چلی جائے اور بھیڑیوں کا شکار بن کر رہ جائے گویا جماعت سے الگ ہو جانے والے افراد ہمیشہ ہلاکت اور خسران سے

دوچار ہوتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اختلاف وانتشار سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے اور انہیں اپنی یہ نعمت یاد دلائی ہے کہ باہمی دشمنی اور عداوت رکھنے کے بعد انہیں بھائی بھائی بنایا ہے۔ قرآن کریم انہی کو حکم دیتا ہے کہ آپس میں مخالفت اور نزاع پیدا ہوتے ہی صلح ومصالحت کی کوششیں بروئے کار لانے کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔ اور ان کوششوں کو کامیاب بنانے میں اگر زیادتی کرنے والے کے خلاف لڑنے کی نوبت آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتّی تفیئی الی امر اللہ۔ (اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں آمادہ پیکار ہو جائیں۔ تو ان دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرو۔ پھر بھی اگر ایک جماعت دوسری کے خلاف بغاوت پر تُلی ہوئی ہو تو بغاوت کرنے والی جماعت کے خلاف مل کر لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کی طرف آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اتحاد واتفاق کے ایک جھنڈے کے نیچے زندگی بسر کرو اور ان قوموں کے نقشِ قدم پر مت چلو جو اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی باہمی تفرقہ اور اختلاف میں پڑی رہیں۔ جو لوگ اسلام کی شاہراہ کو چھوڑ کر دوسری پگڈنڈیوں کی طرف بڑھتے ہیں انہیں قرآن کریم نے بدترین نتائج سے ڈرایا ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا۔ (اور جو کوئی ہدایت کے صاف اور واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کر کے مومنوں کا راستہ چھوڑ دیگا ہم اس کو (دنیا میں) اپنے اعمال کے سپرد کریں گے اور (آخرت میں) جہنم کی آگ میں جھونکیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے)

اسی طرح تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کہہ کر نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت فرض قرار دی ہے۔ سو کلمۂ حق کو بلند و بالا کرنے اور قوم کی عمارت کے مینار کو اونچا کرنے سے بڑھ کر اور کونسی نیکی ہوگی جو باہمی تعاون کی زیادہ مستحق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ کا دستِ اعانت جماعت کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ جب اجتماع صحیح مقصد کے لئے ہو اور باہمی الفت سچی ہو تو قدرت الٰہیہ کی اعانت کافی اعانت ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں اتفاق کو اتنا اہم مقام حاصل ہے کہ کسی خاص حکم کے بارے میں قوم کا اجماع یعنی متفقہ فیصلہ اللہ تعالےٰ کے حکم کے لئے کاشف قرار دیا گیا ہے اور اس پر عمل کرنا عام مسلمانوں پر لازم ہے اور اس سے انکار دین سے خارج ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتفاق کا کتنا اہتمام فرماتے تھے؟ وہ آپ کے اس قول سے ظاہر ہے:۔

لَوْ دُعِيْتُ اِلٰى حِلْفِ الْفُضُوْلِ لَفَعَلْتُ (اگر مجھے حلف الفضول کی

طرف بُلایا جاتا تو میں لبیک کہتا[1])

حلف الفضول جاہلیت کی ایک چیز تھی مگر اتفاق کی وجہ سے وہ بھی قبول تھی۔ یہ ہے ان دلائل کا مجمل بیان جن سے اتفاق کے واجب ہونے ایک دوسرے کی مخالفت چھوڑنے اور آپس کی ایذا رسانی سے بچتے رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ شریعت کی رُو سے مسلمانوں کے ساتھ بلکہ ان کی امان میں آنے والے اور پڑوس میں رہنے والے دیگر اہلِ مذاہب کے ساتھ بھی اتفاق واتحاد کے ساتھ پیش آنا ضروری ہے مسلمانوں کی شریعت تنگ نظری پر مبنی نہیں اور اس میں رواداری کے لئے کافی گنجائش موجود ہے۔

اب رہا دوسرا امر یعنی کلمۂ حق بلند کرنے کے لئے حکومت اور سیادت کی توسیع تو اس کے لئے قرآن کریم کا مطالعہ فرمایئے۔ ہر آیت اس کے لئے تندہی سے سرگرم کار ہونے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور اس کے فرائض وواجبات

---

[1] بنی تمیم اکٹھے ہو کر عبداللہ بن جدعان کے پاس ایک وفد کی صورت میں گئے۔ اور اس بات کا حلف اٹھایا کہ ظلم کو رفع کرنے اور ظالم سے حق واپس لینے کی کوشش کریں گے۔ حلف میں یہ جز بھی شامل تھا کہ کسی شخص کے پاس اس کے حق سے زائد کوئی چیز دیکھیں گے تو واپس لیں گے اور ہر ایسی زائد چیز جو ظلم سے حاصل کی گئی ہو اس کے اصل مستحق کی طرف لوٹائیں گے۔ زائد چیز کو عربی میں فضل کہتے ہیں اسلئے اس معاہدہ کا نام حلف الفضول پڑ گیا۔

کی ادائیگی میں سستی دکھانے سے روکتی ہے۔ شریعت کا ایک مہتم بالشان حکم یہ بھی ہے کہ جب تک فتنہ و فساد کا مکمل استیصال نہ ہو جائے اور جب تک اطاعت و فرمانبرداری خالص اللہ کے لئے مسلّم نہ ہو جائے اس وقت تک مسلمانوں کے لئے شجرِ ملّت کی شاخیں بڑھانے اور پھیلانے میں توقّف کرنا جائز نہیں۔ سیرت و سنت محمدی میں بھی ان آیات کی تائید میں بے شمار نصوص و روایات موجود ہیں اور کسی سچے مسلمان کو ان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

کیا ان اختلافات کے ہوتے ہوئے جو آج ہم میں موجود ہیں اور ان مظالم کو آسانی سے برداشت کرتے ہوئے جو ہم پر توڑے جا رہے ہیں ہمارے لئے فرائضِ دین کے پابند ہونے کا دعویٰ زیب دے سکتا ہے۔ کبھی نہیں! اکثر احکام دینیہ کا اجراء ایک مضبوط شرعی حکومت کے وجود پر موقوف ہے۔ اگر اقتدار و سیادت اور باہمی اتحاد براہِ راست فرائض مذہب میں شامل نہ بھی ہوتے تب بھی ان کا حاصل کرنا ضروری ہوتا کیونکہ ان کے بغیر دیگر فرائض کا سرانجام دینا ناممکن ہے لیکن اب جب کہ مذکورہ دلائل سے ان کا رکنِ شریعت ہونا اور مقاصدِ دین میں شمار کیا جانا بھی ثابت ہو چکا تو ان کی ادائیگی کے لئے جدوجہد نہایت ضروری ہے جب بارگاہِ خداوندی میں بندوں کے اعمال پیش ہوں گے اور ان کے نیک و بد کا حساب لیا جائے گا۔ اور جب ساری دوستیاں اور سفارشیں بیکار ہو جائیں گی۔ اس وقت خدا کے سامنے ان دو عظیم رکنوں کے متعلق اپنی کوتاہیوں

کو مٹانے کے لئے آپ کیا عذر پیش کریں گے۔ ہماری تعداد ۱۰۰ کروڑ یا اس سے کچھ زیادہ ہے کیا ہم ان دونوں ارکان کو قائم کر کے اپنی سفارش کا بہترین سامان نہیں کر سکتے؟ ذرا خلوت میں اپنے دلوں کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ کیا آپ کا ضمیر آپ کو اپنی موجودہ حالت پر ملامت کرتا ہے؟ اور کیا آپ کے سمجھانے اور عذر پیش کرنے سے مطمئن ہو کر وہ ملامت چھوڑ سکتا ہے؟

ہمارے ممالک پر بلائے مبرم کی طرح نازل ہونے والے مصائب جنہوں نے ہماری عزت و آبرو کو ختم کر دیا کبھی ہمیں اپنے تیروں سے چھلنی نہ کر سکتے اور اپنے نیزوں سے زخم نہ لگا سکتے، اگر ہم خود ہی آپس کے اختلافات میں منہمک ہو کر ایک دوسرے کی امداد سے منہ نہ موڑ لیتے اور خداوند کریم اور نبی صلّی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے بے نیاز ہو کر بے مروّتی اور دشمنی میں ایک دوسرے سے پیش پیش نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کا بلند کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ جسے ہم بہ آوازِ بلند پڑھتے ہیں اور جس کے ذکر سے اطمینانِ قلب حاصل کرتے ہیں، ہم سے بیشمار حقوق کا مطالبہ کرتا ہے اگر ہم ان حقوق کی بجا آوری میں سرگرمی سے کام لیتے تو کیا اجنبی طاقتوں کو یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ ہمارے ممالک کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔ کیا وہ ہمارے سامنے ظلم و تعدی کی برق وش تلواروں کا مظاہرہ کر سکتے؟ اور کیا ہمیں ان کے جور و ستم کی آگ کے شعلے دیکھنے کا موقع ملتا؟ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کی آگ دیکھ لیتے مگر اس وقت جب ہمارے قدم فاتحانہ

ان کے قلعوں میں داخل ہوتے اور ہمارے ہاتھ ان کے سروں پر دستِ شفقت پھیرنے کے لئے آگے بڑھتے۔ ہم مانتے ہیں کہ فرزندانِ اسلام اپنی شریعت کے احکام پر دل و جان سے یقین رکھتے ہیں۔ مگر کیا کسی مذہب پر یقین کرنے کے بعد انسان کا یہ فرض نہیں ہو جاتا کہ وہ اس مذہب کے فرائض و واجبات کو بھی بطریقِ احسن سرانجام دینے کی سعی کرے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○

(کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ایمان کا اقرار کرنے پر انہیں امتحان اور آزمائش میں ڈالے بغیر چھوڑ دیا جائیگا۔ بے شک ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی آزمائش بھی کی تھی تو اللہ تعالیٰ سچے لوگوں کو بھی ضرور ظاہر کرکے دکھلائیں گے اور جھوٹوں کو بھی ضرور ظاہر کرکے دکھلائیں گے)۔

بلاشک مومن یہی چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے سچوں میں شمار کرے وہ جھوٹوں میں شمار ہونا پسند نہیں کرتا۔ سچے اور جھوٹے کے امتیاز کے لئے آزمائش کا معیار اگر عمل کی سچائی نہیں تو اور کون سی سچائی کا ظہور ہوگا۔ حیاتِ دنیوی کو حقیر سمجھنا مسلمانوں کے لئے قوتِ ایمان کی نشانی ہے۔ کیا اس بات کا یقین رکھتے ہوئے کسی مسلمان کے دل میں ذلت اور رسوائی کی ہزار سال لمبی عمر کی تمنا پیدا ہو سکتی ہے؟ اپنے آپ کو مومن سمجھ کر اور اپنے شاندار ماضی کو ذہن میں رکھ کر کیا ہم مسلمان رسوائی اور

گدائی کی ذلیل اور جبری زندگی برداشت کر سکتے ہیں ؟ اور اپنے ممالک اور جاگیروں میں اس طاقت کے جابرانہ احکام کی تعمیل کر سکتے ہیں جو نہ ہمارے ساتھ مذہب میں شریک ہے نہ خیالات میں جس کے دل میں ہماری شریعت کا کوئی احترام نہیں اور جسے ہماری کسی قرابت اور کسی تعلّق کا پاس نہیں جس نے اپنی ساری قوتیں صرف اس مقصد کے لئے وقف کر رکھی ہیں کہ کسی طرح ہمارے وطنوں کی سرزمین کو ہم سے خالی کرا کے اپنے ابنائے وطن اور اپنی توم کے آباد کاروں سے پُر کر دے؟ نہیں ،ہرگز نہیں۔ جو لوگ ایمان اور اخلاص کا سرمایہ رکھتے ہیں ۔جن کا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم ۔ (اگر تم اللہ (کے دین) کی امداد کے لئے اُٹھو گے تو اللہ تمہاری امداد کرے گا ۔ اور تمہیں ثابت قدم رہنے کی توفیق بخشے گا) پر یقین ہے. وہ کبھی اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں صرف کرنے سے دریغ نہیں کریں گے. وہ جد و جہد سے کس طرح پہلو تہی کر سکتے جب کہ حق کی آواز انہیں ہر وقت پکارتی ہے ۔جبکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی حکومت پر یقین ہے ۔اور جبکہ وقت کی ضرورت ان کی جد و جہد کی متقاضی ہے ۔ نورِ الٰہی اور فراست ایمانی سے فیض یاب ہو کر دیکھنے والا مسلمان یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ دینِ الٰہی کی امداد اور اس کی تائید و استحکام کی کوششیں اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہیں جب مخلص اور راستباز فرزندانِ توحید آپس میں متحد و متفق ہو جائیں .کیا اخلاق اور غیرت کے کسی قانون سے یہ بات جائز ہو سکتی ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے عَلَم سرنگوں

کئے جا رہے ہوں۔ ہماری املاک اور جاگیروں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہوں،
اور ان چند ممالک کے بارے میں بھی جو اس وقت ہمارے قبضے میں رہ گئے ہیں،
اجنبی طاقتیں آپس میں قرعہ اندازیاں کر رہی ہوں اور ہم ان ساری ذلتوں کو خاموشی
سے دیکھتے رہیں۔ کوئی سرگرمی نہ دکھائیں۔ کسی ایک مقصد پر متفق نہ ہوں اور
اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اور شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے
کے دعویدار بنے رہیں۔ اگر یہ احساس، اور وقت کی یہ پکار ہمارے دلوں میں
گزر جائے تو یقیناً ہماری ندامت و خجالت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ لیکن میرا
گمان یہ ہے کہ کسی کلمہ گو کے دل میں اب تک یہ باتیں گزری ہی نہیں وطن اور
اسلام کی حفاظت کی سچی خواہش۔ سیادت اور تسلط کی تمنا اور اتحاد و اتفاق
کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے مگر افسوس ہے کہ انہیں ان عوارض و
حوادث نے جن کی طرف ہم گزشتہ اشاعتوں میں اشارہ کر چکے ہیں دین اور
وقت کی آواز کی طرف کان لگانے کی فرصت نہیں دی۔ حق کی یہ آواز انہیں
برابر زور زور سے پکار رہی تھی۔ مگر یہ مدتوں اس کے سننے سے غافل رہے۔
ہاں یہ بھولے ہوئے تو ہیں مگر بھٹکے ہوئے ہرگز نہیں۔ ان کے قدم کو ٹھوکر تو
لگی ہے مگر یہ گمراہ کبھی نہیں ہوئے۔ انہیں تو دہشت اور تحیر نے گھیر رکھا ہے
ان کی مثال اُن مسافروں کی طرح ہے جو باہم مل کر اندھیری رات میں ایک بالکل
نئی سرزمین کا سفر کر رہے ہوں ان میں سے ہر ایک امداد کا طالب ہو اس کا مددگار

اُس کے ساتھ شریک سفر ہو مگر اندھیرے کی وجہ سے وہ اُسے معلوم نہ کر سکے۔

اگر ہمارے باعمل علما مسلمانوں کی آواز کو دوسرے بھائیوں تک پہنچانے کی خدمت پر اپنی توجہ مرکوز کر لیتے تو ان کے خیالات اور مقاصد کو ایک نقطے پر جمع کرنا بہت آسان تھا۔ یہ کام اب بھی کچھ مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت الحرام کو باقی سارے قطعاتِ زمین سے زیادہ احترام بخشا ہے۔ ہر مسلمان پر بہ شرط استطاعت حج کرنا فرض ہے۔ اس ذریعے سے اس سرزمین پر ہر سال ہر طبقہ ہر خطّے اور ہر نسل کے مسلمان باہم مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کوئی با اثر اور برگزیدہ شخصیّت ایک ایسا نعرۂ حق بلند کرے کہ تمام اطراف واکناف عالم میں حرکت و عمل کی لہر دوڑ جائے۔ اور سکون پسند دلوں میں اضطراب اور اضطراب سے عمل کے لئے بے قراری پیدا ہو جائے۔

عقائد دینیہ کی بدولت اس منصوبے کی تکمیل کے لئے زمین ہموار ہو چکی ہے اور اگر اس کے ساتھ ہی میں یہ اضافہ بھی کر دوں کہ اجنبی طاقتوں کے ظلم و تعدّی نے مسلمانوں کے دلوں کو پگھلا دیا ہے۔ پردیسیوں نے ان کے شہروں اور ممالک میں لوٹ مچا کر ان کے سینوں میں بے چینی پیدا کر دی ہے اور اس وقت تک وہ سسکیاں لے لے کر زندگی بسر کر رہے ہیں تو میں یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گا کہ مسلمانوں میں انقلاب کی استعداد اور ہمواری بڑی حد تک موجود ہے اور یہی نتیجہ اس مقصد کے لئے کوشش کرنے والوں کی ڈھارس بندھاتا اور اس میں

کامیابی اور منزل کی طرف بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی امداد اُن کے ساتھ ہے اس کی رضا طلب کرنے والا کبھی گھاٹے میں نہیں رہا۔ وھو ربی الیہ ادعوا والیہ انیب ۰

اخوت کا پیغام

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ خَیْراً جَمَعَ کَلِمَتَھُمْ (اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کے کلمہ کو ایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے)۔

فارسی جراید کی یہ بات ہمیں بہت پسند آئی کہ وہ معتدل پالیسی کے ساتھ اپنے وطن کی سچّی خدمت میں معروف ہیں۔ اور اس بات سے ہمیں اور بھی مسرّت ہوئی کہ وہ ہمارے جریدہ کے بعض ایسے اہم حصّوں کا بڑے اہتمام سے ترجمہ فارسی میں شائع کرتے ہیں جو ان کے خیال میں مسلمانوں کے افکار میں بیداری پیدا کرتے اور ان کی عقلوں کو اپنی بھلائی کی طرف متوجّہ کرتے ہیں۔ ہم اپنی اور ہر مخلص محب قوم کی طرف سے ان جرائد کا عموماً اور طہران کے جریدہ اطلاع کا خصوصاً بہت شکریہ ادا کرتے ہیں ممالک اسلامیہ کو فائدہ پہنچانے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے سارے ممالک کے باشندے اگرچہ مختلف قوموں اور مختلف زبانوں میں منقسم ہیں مگر فارسی بولنے اور سمجھنے میں سب شریک ہیں۔ فارسی کو مشرق میں وہی اہمیت حاصل ہے جو فرانسیسی کو مغرب میں ہے۔ ہماری دلی آرزو تھی کہ فارسی جرائد اپنے بلند پایہ اور پُرخلوص شذرات و مقالات کے ذریعے ہمارے افکار کی تائید کریں۔ خصوصاً اُن افکار

کی جو اتحادِ اسلامی اور مسلمانوں کے درمیان قومی روابط قائم کرنے سے تعلق رکھتے ہیں
ان جرائد کو یوں تو یہ دعوت اتحاد تمام دنیا کے مسلمانوں کو دینی چاہیئے مگر
ایرانیوں اور افغانیوں کے باہمی اتحاد کی ضرورت و اہمیت خاص طور پر پیش نظر رکھنی
چاہیئے کیونکہ یہ دونوں گروہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں اور ایک ہی جڑ کے دو
تنے ہیں اور وہ ہے پرانی فارسی نسل۔ اسلام کے مضبوط رشتے نے انہیں ایک دوسرے
سے اور بھی قریب کر دیا ہے۔ اب ان کے درمیان معمولی جزئی اختلافات کے سوا
کوئی اہم اختلاف موجود نہیں وہ جزئی نوعیت کا اختلاف بھی ایسا نہیں کہ اس کی وجہ
سے باہم دست و گریباں ہو کر سر پھٹول کی جائے اور اتحاد کی ریشمی خلعت کو پارہ
پارہ کر دیا جائے۔ کوئی سلیم الطبع انسان یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس قسم کے معمولی
اختلافات کو شدید ترین معاندت کا بہانہ بنا لیا جائے۔

ایرانیوں کی بلند ہمتوں اور عالی افکار سے یہ بعید نہیں کہ وہ اتحادِ اسلامی
کی تجدید و تقویت کے لئے اسی طرح پہلا قدم اٹھائیں گے جس طرح انہوں نے
ابتدائے اسلام میں علوم کی نشر و اشاعت احکام اسلامی کی حفاظت اور اسرارِ
دینی کی وضاحت کے سلسلے میں اُٹھایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شریعتِ مقدسہ
کی خدمت ہر ممکن طریقہ سے کی اور اس میں کسی قسم کی تقصیر روا نہ رکھی۔

ہاں بخاری، مسلم نیشاپوری، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد۔ بلخی ابوجعفر
بلخی، کلینی اور دیگر علماء ایران ہی کی خاک سے اُٹھے۔ ابن ذکریا رازی اور امام

فخرالدین رازی نے طہران میں تربیت حاصل کی۔ حجۃ الاسلام امام ابو حامد غزالی، ابو اسحاق اسفرائنی، بیضاوی، خواجہ نصیرالدین طوسی۔ ابہری۔ عضدالدین ایجی وغیرہ علم کلام واصول کے وہ نامور ہیں جن پر ایران کو ناز ہے۔ مشہور فلسفی ابو علی بن سینا، شہاب الدین مقتول اور ان جیسے کئی اور نام ور افراد ایران کی سرزمین میں وہیں کی مٹی سے پیدا ہوئے ایرانیوں ہی نے سب سے پہلے عربی زبان کے اصول وقواعد منضبط کئے۔ اور اس فن میں رضی اور سیبویہ نے لازوال شہرت حاصل کی۔ ایرانیوں ہی نے علوم بلاغت کی اساس رکھی۔ جس کے ذریعہ قرآنی اعجاز کی وضاحت ہوئی۔ اور انسانی دست رس کی حد تک قرآنی دقائق کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ اس علم کے موجد عبدالقادر جرجانی ایران ہی کے باشندے تھے۔ ایران کے ایک گاؤں سے جوہری صاحب صحاح اور وہیں کے ایک شہر سے مجدالدین فیروزآبادی صاحب قاموس پیدا ہوئے۔ زمخشری، سکاکی، ابوالفرج اصبہانی۔ بدیع الزمان ہمدانی جیسے اساطین علم وادب جنہوں نے قرآنی دقائق کی تشریح اور ارکان دین کے استحکام میں نمایاں حصہ لیا۔ سب اسی سرزمین سے اٹھے۔

آگے چلئے۔ مؤرخین کے قافلہ سالار طبری اور جغرافیین کے قائد اصطخری اور قزوینی بلاد فارس ہی کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح شبلی نہاوند کا بایزید بسطامی بسطام کا۔ اور محی الدین ابن عربی کا حقیقی استاذ ہروی ہرات کا رہنے والا تھا اور یہ سارے شہر ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔

پھر کیا صدر الشریعہ ۔ فخر الاسلام بزودی ۔ آمدی ۔ مرغیناتی ۔ سرخسی ۔ سعد تفتازانی ۔ میر سید شریف اور ابی ورد جیسے فرزندان ایران کو اسلامی تاریخ سے لگاؤ رکھنے والے بھلا سکتے ہیں ؟ اور کیا صدر الدین شیرازی ۔ قطب الدین شیرازی میر فندرکسی اور متاخرین میں فلاسفہ کا سرتاج میر باقر داماد ایران کے رہنے والے نہیں تھے ؟ وہ کونسا فن ہے جو فضیلت میں شمار ہونے کے بعد ایرانیوں کی دسترس سے باہر رہا ہو ۔ اور کونسا امتیاز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سرفراز کیا ہو اور ایرانی اس کے حصول کے لئے سارے مسلمانوں سے پیش پیش نہ رہے ہوں اور ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان لَوْ کَانَ الْعِلْمُ فِی الثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رِجَالٌ مِنْ اَبْنَاءِ فَارِسٍ بھی تو انہی کے بارے میں صادر ہوا ہے

تو اے فرزندان فارس ! علم پر آپ نے جو احسانات کئے ہیں انہیں یاد کیجئے اور اسلام میں آپ کے جو نقش قدم باقی ہیں ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے اور اب مذہبی اتحاد کے لئے اسی طرح ستون بن جایئے جس طرح آپ اسلام کے دور عروج کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو گئے تھے ۔ جس بہادری اور جاں نثاری سے آپ نے اسلام کی خدمات انجام دی ہیں اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کو عروج سے دوبارہ ہمکنار کرنا بھی آپ ہی کا کام ہے ۔ اتحاد اسلامی کی بنیاد رکھنے کی توقع بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کی بہ نسبت آپ ہی سے زیادہ کی جا سکتی ہے ۔ یہ کام آپ کے عزائم کی بلندی و پائداری اور خاندانی فضائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے لئے مشکل نہیں ۔ میرے خیال میں آپ کے لئے اب یہ علم

کوئی پوشیدہ راز نہیں رہا کہ آپ کو افغانیوں کے ساتھ ملنے کی دعوت دینے کا یہی بہترین وقت ہے۔ اسی وقت آپ ان کے ساتھ ظلم اور سرکشی کرنے والوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر سکتے ہیں اور اتحاد و اتفاق کا ایسا مضبوط اور ناقابلِ تسخیر حصار بنا سکتے ہیں کہ لالچی دشمن قدم اٹھانے کی جرأت نہ کر سکیں۔ میرے خیال میں یہ بات آپ کو بھولی نہ ہوگی کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں اسی لئے جم گئے کہ ایرانی اور افغانی آپس کے جھگڑوں میں مشغول تھے۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوستان کا ہر مسلمان پنجاب کی طرف ٹکٹکی لگائے انتظار کر رہا ہے کہ آپ افغانیوں کیساتھ اتحاد کرکے کب پنجاب کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ آپ نے کافی تجربے حاصل کئے اور آپ کی چشمِ بصیرت نے حوادث اور واقعات کے بے شمار مظاہر سے سرمۂ عبرت حاصل کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے قومی اتحاد کی شاندار عمارت منہدم ہو گئی ہے کیا اس کے بعد ایک دوسرے سے جفاکاری اور بے رخی کا برتاؤ جاری رکھنے کے لئے آپ کوئی وجہِ جواز پیش کر سکتے ہیں؟

یہ آپس میں بھائی بندی اور اتفاق کا وقت ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ملنے اور باہمی اعتماد کا زمانہ ہے۔ دشمنوں نے آپ کے ممالک کا احاطہ مشرق اور مغرب دونوں طرف سے کر لیا ہے۔ ان کا ہر فرد اپنی تلوار کو سان پر چڑھانے اور اپنے تیروں کو سیدھا کرنے میں مصروف ہے۔ اور آپ کے ممالک اور مقبوضات

پر حملہ کرنے اور لوٹ مار مچانے کے لئے موقع تلاش کر رہا ہے۔ اگر اس وقت آپ نے فرصت کو غنیمت نہ سمجھا اور یہ وقت یوں ہی ضائع کر دیا۔ تو عمر بھر پچھتانا پڑیگا

جہاں تک ہمارے علم میں ہے امیر عبدالرحمٰن خان والئی افغانستان اپنے آغاز جوانی سے یورپ کا شدید ترین دشمن ہے —— اس کے اور دولِ یورپ کے درمیان وہ جان فرسا اختلافات ہیں جن کا ازالہ مشکل ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ یہ عداوت ہر افغانی کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے مگر اب بھی ایران اور افغانستان میں اتحاد کا رشتہ قائم ہو جائے تو سارے اسلامی طبقوں کو مشرق میں ایک نئی قوت بہم پہنچ جائے گی۔ افغانیوں۔ ایرانیوں اور دیگر مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی۔ ان کی عظیم الشان امیدیں از سرِ نو زندہ ہو جائیں گی اور اسلام کی روح کو ایک تازہ و جاں بخش توانائی حاصل ہو جائے گی۔ اِس وقت افغانی مدّبرین اس حکمت عملی کا مطالعہ بڑی توجہ سے کر رہے ہیں جو ان کے پڑوسیوں نے مصری مسائل کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے۔ لہٰذا ایرانیوں کے لئے یہ بہترین اور عظیم ترین فرصت ہے کہ ان کے ساتھ رشتۂ اتحاد مضبوط کر لیں۔

یہ عمل سب اعمال سے جلیل القدر اور سب سے زیادہ بیش بہا فائدوں کا حامل ہے۔ یہ سب سے بڑی فضیلت ہو گی کہ اہل الرائے ایرانی۔ ایران و افغانستان کے اتحاد و اتفاق کے موضوع پر مقالات لکھیں اور ٹریکٹ شائع کر کے تقسیم کریں۔ یہ کام عوام کے لئے یقیناً بہت موثر ثابت ہو گا اور اگر علمائے کرام

اور مجتہدین بھی اس کام کو سرانجام دیں - تو اسے اور بھی چار چاند لگ جائیں گے۔

اس قسم کے مقالے لوگوں میں تہذیب و شائستگی کی روح پھونکنے، ان میں صحت مند اور صالح فکر کی بنیادیں استوار کرنے اور ان کے دلوں سے دین و دنیا کو بگاڑنے والے حسد اور کینے کا ازالہ کرنے میں بہترین معاون ثابت ہوں گے۔

اور پھر اس وقت جب کہ صاحبِ بصیرت لوگ خطبے دیں، وعظ و نصیحت کریں اور مذہبی حدود اور شرعی قوانین کا لحاظ رکھتے ہوئے مقالات لکھیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا فضل ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے۔

افغانیوں اور ان کے ایرانی بھائیوں میں فرق ہی کیا ہے - دونوں اللہ تعالیٰ اور شریعتِ محمدیہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ عبدالرحمٰن خان کو تجارب نے جو بصیرت عطا کی ہے اس سے ہمیں امید ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے اتحاد کے لئے اپنی طرف سے پہل کریں گے۔ اسی طرح شاہِ ایران کے متعلق ہمیں یقین ہے کہ ایک جہاندیدہ اور صاحبِ بصیرت فرماں روا ہونے کی حیثیت سے وہ بھی اتحاد کی طرف پیشقدمی کرنے اور اس کے لئے جدوجہد عمل میں لانے سے کبھی دریغ نہ کریں گے پھر بھی اس بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس نے عملی اقدام میں پہل کی وہ مسلمانوں میں خصوصاً اور تمام عالم میں عموماً بڑا صاحبِ فضل شمار کیا جائیگا۔ اور اس کے ثمرات سے بہت جلد متمتع ہو گا۔

جرمنوں کا عیسائی مذہب کے بارے میں ایسا ہی فروعی اختلاف تھا جیسا

ایرانیوں اور افغانیوں کا مذہب اسلام کے بارے میں ہے۔ جب اُن کے فروعی اختلافات کا اثر سیاسی اتحاد پر پڑا تو اس قوم میں کمزوری پیدا ہوگئی۔ ہمسایہ سلطنتوں کے جارحانہ حملے بڑھ گئے اور یورپ کی سیاست میں اُن کی کوئی آواز نہ رہی لیکن جب انہوں نے اپنی حالت پر نظر ثانی کی، اپنے ملی اتحاد کے بیش قیمت اصول وضوابط پر کاربند ہوئے اور عام مصالح میں وطنی اتحاد کو لائحہ عمل بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں میں دوبارہ وہ قوت اور شوکت عطا کی جس کی بدولت وہ آج یورپ کے حاکم ہیں اور پوری مغربی سیاست کی میزان ان کے ہاتھ میں ہے۔

ہم جریدۂ فرہنگ (اصفہان) اور جریدۂ اطلاع (طہران) کے محترم مدیروں سے خصوصاً اور دیگر ایرانی صحافیوں سے عموماً یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس بلند مقصد کی طرف متوجہ ہوں گے اپنے جرائد میں اس موضوع کو نمایاں اور کافی جگہ دیں گے۔ اور اپنے وطن میں فارسی زبان کے ذریعے جو دونوں ملکوں کی مشترکہ زبان ہے۔ ان خیالات کو عام کریں گے۔ اس کے بعد صرف چند ہی روز کی بات ہوگی کہ ہم ترقی سے ہمکنار ہو کر منزل مقصود پر فائز ہو جائیں گے۔ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ o

دعوتِ اتحاد

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔

(اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جو کھلی ہدایتوں کے آجانے کے بعد بٹ گئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے۔ اور یہ لوگ، ان کے لئے عذاب ہے)

ہندوستان پر روسی حملہ کا وقت قریب سے قریب تر آرہا ہے۔ اس وقت مغربی حکومتوں کی سیاسی رفتار اور یورپ میں صلح کی بنیاد ڈالنے کے لیئے ان کا انتہائی اشتیاق روسیوں کے مقاصدِ ملّی کے حق میں مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اور ان کے لیئے اسباب کی تیاری اور مدت کو کم سے کم بنانے میں بہترین معاون ثابت ہو رہا ہے۔ یہ سیاست کا ایک نیا انقلاب ہے اگر اس وقت حکومت ایران نے افغانستان کے ساتھ اتفاق کر لیا ہوتا تو دونوں کو عظیم الشان فوائد حاصل ہو جاتے انگریزوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے دلوں میں جو نفرت و حقارت موجود ہے وہ اگرچہ روس کو کافی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ مگر ابھی اس راستہ میں ایسی دشوار گزار گھاٹیاں موجود ہیں جنہیں عبور کرنے کے لیئے ایرانیوں اور افغانیوں کی دوستی ہی کام آسکتی ہے۔ ہندوستان روس کی فوجی چھاؤنیوں سے بہت دُور ہے۔ روس کو یہاں تک پہنچنے کے لیئے بہت سے نامعلوم راستوں اور پُرپیچ پگڈنڈیوں کو طے کرنا پڑیگا۔ روس کو ابھی ہندوستانی نوابوں اور راجوں کے ساتھ خط وکتابت کرنے اور ان کے اخلاق و عادات اور عواطف و جذبات پر اطلاع پانے کی ضرورت ہے اس میں روس کو اُسی وقت کامیابی حاصل ہو سکتی ہے جب وہ اپنے مصالحانہ اور محاربانہ دونوں قسم کے معاملات میں اپنے ساتھ ایرانیوں اور افغانیوں کو بھی شریک کرے۔ وہ ہندوستان کے دروازے کھولنے اور اس پر قبضہ کرنے کے لیئے افغانستان اور ایران سے اُسی وقت مدد لے سکتا ہے جب اِن

دونوں حکومتوں کو مال غنیمت میں حصہ دے اور انہیں اپنے ساتھ منافع میں شریک کرے۔ ورنہ یہ دونوں حکومتیں اس کے اہم ترین مقصد یعنی فتح ہندوستان کے راستے میں ایک مضبوط چٹان کی طرح سدِ محکم ثابت ہوں گی۔

اگر روس تنہا اس شکار کو ہڑپ کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ کیا اس کے لئے ہندوستان میں حائل ہونے والے پہاڑوں کو چیر کر آگے نکل جانا ممکن ہے؟ کیا روسی وہاں کی تنگ گزرگاہوں میں رہنے والے شیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ روس خود بھی مشکلاتِ کار کی تفصیلات سے بے خبر نہیں، اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جو قوم ایک ملک میں زمانۂ دراز تک رہائش اختیار کرکے ایوانِ مجد وافتخار کے مدارج عالیہ پر قبضہ کر چکی ہے اُسے اس کی ساری عظمتوں کے ساتھ باہر نکال دینا بہت بڑا کام ہے جس کے لئے ایک کثیر التعداد جماعت کی مدد درکار ہو گی۔ اس وقت اس کام کے لئے ایران اور افغانستان سے بہتر کوئی حکومت نہیں۔ اس لئے اس کی حکمتِ عملی اور تدبّر سے یہ بعید ہے کہ وہ اس مہم کے ثمرات اور فوائد کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص رکھنے کی کوشش کرے۔ خصوصاً جب کہ ہندوستان کے دروازے کھولنے سے اس کا مقصد تجارتی فوائد سے متمتع ہونا ہے۔ اب افغانیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ آنکھیں کھولیں، کمرِ ہمت باندھیں، غور وفکر اور حزم وتدبر سے کام لیں اور آنے والے دور میں ان کی قسمت کا جو فیصلہ ہونے

والا ہے، اُسے اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ایرانی بھائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ عمومی مسائل کے بارے میں مختلف سیاسی پالیسی رکھنے کے لئے افغانیوں اور ایرانیوں میں کوئی مابہ النزاع موجود نہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی اصل سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں میں دینِ اسلام جیسا قوی اور اشرف ترین رابطہ قائم ہے۔ افغانیوں اور ایرانیوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس نازک موقع پر ان کا باہمی اختلاف نہ صرف ان کے لیے بلکہ ان کے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کے لئے بھی بے حد مضر ہو سکتا ہے اس لئے دونوں کا یہ فرض ہے کہ کلمۂ اتحاد لا الٰہ الا اللہ اور دینی روابط کا وقار قائم رکھیں اور چھوٹے چھوٹے مذہبی اختلافات کو کلمۂ اسلام کی عزت گھٹانے اور حقیقی روابط کو قطع کرنے کا بہانہ نہ بنائیں۔ ایک جزئی اختلاف کی خاطر سارے نقشِ اتحاد کو مٹا دینا کسی طرح بھی دانشمندانہ فعل نہیں۔

میرے خیال میں دونوں ملکوں پر بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ ان پر جتنے بھی مصائب نازل ہو چکے ہیں ان سب کا سبب آپس کے اختلاف ہی تھے۔ فروعی اختلافات کو سابقہ زمانوں میں بھی بعض اربابِ سیاست نے مخالفتوں اور ضد بازیوں کا آلۂ کار بنایا تھا۔ اور بسا اوقات انہیں ان کوششوں کا فائدہ بھی پہنچا ہے لیکن آج اس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ میرے خیال میں یہ حقائق کسی عاقل کی نظروں سے مخفی نہیں ہیں۔ اس وقت ان اختلافات کے دروازے پر تماشائی بن کر کھڑے رہنا غلط

ہے۔ افغانیوں کو اس سے آگے بڑھ کر وحدتِ اسلامیہ کے وسیع احاطہ میں پہنچنا چاہیئے۔ انہیں ہر طرف سے خطرات نے گھیر رکھا ہے اور ان کی نجات کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے ایرانی بھائیوں کے ساتھ اِتّفاق و اتّحاد قائم رکھیں اس کے لئے اس سے بہتر وقت کبھی نہ آئے گا۔ افغانیوں کے پاس اس مقصد کو ٹالنے کا کوئی عذر موجود نہیں خصوصاً جب کہ اس وقت ایران کی صدارتِ عظمٰی پر ایک ایسا شخص فائز ہے۔ جو وسیع علم و معرفت کا مالک ہے۔ کثرت کے مظاہر اُسے وحدت کے مطالعہ سے غافل نہیں کر سکتے۔ مختلف اور متنوّع واقعات کے درپیش ہونے پر بھی وہ تمکنت اور وقار کے صدر نشین کو چھوڑ کر تلوّن کے پا انداز کی طرف نہیں اُترتا۔ افتراق کے پرتو اُسے جمعیت اور اتّفاق کے مشاہدے سے نہیں روکتے وہ کثرت کے تمام مراتب میں وحدت کا جلوہ دیکھتا ہے اور تعدّد کی ہر منزل میں احدیت کی حقیقت سے روشناس ہوتا ہے۔ اتّحاد و اتّفاق ہی اس کا مذہب ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ بلا استثنا ہر ایرانی کا مشفق باپ ہے۔ وہ بلا لحاظ اختلاف مذہب ان کی آواز کو متّحد کرنے کے لئے جد و جہد کر رہا ہے اور صرف حقیقی روابط و علائق کی رعایت ضروری سمجھتا ہے۔ افغانیوں کا یہ پہلا اور آخری فرض ہے کہ ان اوقات میں اپنے ایرانی بھائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور فرصت کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

افغانیوں اور ایرانیوں کو چاہیئے کہ اپنے ممالک کے تحفظ کے لئے اتحاد و

اتفاق ہی کی فصیل کھڑی کریں اور اسی کو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین وسیلۂ حرب بنائیں اور اسی کے سرچشمے سے اپنے ممالک کی فلاح و بہبود اور خوشحالی و سیرابی کا سامان مہیا کریں۔ اسی طرح وہ خود بھی شرف و ترقّی کے بلند مدارج طے کر سکیں گے اور آنے والی نسلوں کے لئے بھی دائمی عزت و سرفرازی کی دولت وراثت میں چھوڑیں گے۔

اقتدار

نصرانیت اور اسلام

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ۔ (بے شک اس میں پوری نصیحت ہے اُس کے لئے جو (سینہ میں) دل رکھتا ہو یا دل لگا کر سُنے)

خداوند تعالےٰ نے دنیا میں انسان کو صنّاع بنا کر بھیجا۔ اس کو اپنا کام آپ کرنے کی سہولتیں عطا کیں۔ ایجاد و اختراع کے نئے نئے راستے سوچنے کی توفیق بخشی اور اسے نہ صرف اپنے ہاتھ کی کمائی سے اپنا رزق حاصل کرنے کا طریقہ بتایا بلکہ اسی کمائی پر اس کے وجود اور بقا کا انحصار رکھا۔ تنگدستی ہو یا فراخدستی افلاس ہو یا تونگری۔ فردیت ہو یا شہریت ہر حال میں وہ اپنی کمائی ہی سے بنتا ہے اس کی روزی زمین کی کاشت یا مویشیوں کی دیکھ بھال سے حاصل ہوتی ہے اس کے سردی و گرمی سے حفاظت کرنے والے تمام ملبوسات اس کے ہاتھوں سے بُنے جاتے ہیں اور زمین کی خراشوں سے اس کے پیروں کی حفاظت کرنے والے پاپوش اُسی کے ہاتھوں سے گانٹھے جاتے ہیں اس کے جھونپڑے اور گھر اسی کی سوچ اور فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس کے پاس عیش و تنعم کے جتنے بھی دلفریب سامان موجود ہیں وہ درحقیقت اسی کے اعمال و افکار ہیں جو مادی شکل اختیار

کر کے سامنے آتے ہیں۔ اگر وہ ایک گھڑی کو بھی اپنے لئے خود کام کرنے سے ہاتھ اُٹھالے اور فطرت کے سامنے ہاتھ پھیلا کر زندگی کے لئے ایک سانس کی درخواست کرے تو فطرت اس کے بارے میں بخل ہی سے کام لے گی اور اسے عدم کے عمیق غار کی طرف دھکیل دے گی۔ جس طرح اسے اپنی معیشت کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے اسی طرح خود اس کام کا طریقہ جاننے کے لئے جدوجہد اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر ان طریقوں سے کام لینے کی مشق حاصل کرنے کے لئے بھی وہ عمل ہی کا محتاج ہے بالفاظ دیگر خود اس کی صنعت وحرفت بھی اس کے اپنے ہاتھ کی پیداوار ہے وہ اپنی زندگی کے سارے مظاہر میں ایک صناعی عالم ہے۔ فطرت اور اس کے آثار سے بالکل دُور مگر اسے قدم قدم پر فطرت کی ایسی ہی ضرورت پڑتی ہے جیسے کوئی اہلِ حرفہ اپنے اوزار کا محتاج ہوتا ہے۔ کھانے، پینے، لباس اور مکان کے معاملے میں انسان کی یہی حالت ہے۔

اس حالت کو یہیں چھوڑ دیجئے اور ذرا انسان کے نفسیات پر غور کیجئے۔ ادراک، تعقل، اخلاق، ملکات اور روحانی تاثرات ان سب اشیاء میں وہ آپ کو پھر ایک صناعی عالم نظر آئے گا۔ اس کی شجاعت اور بزدلی، گھبراہٹ اور استقلال شرافت و دنائت، بلند نظری اور کم مائیگی، سخت دلی اور نرمی، عفت اور لالچ اور اس کے دیگر تمام ذہنی کمالات اور نقصانات سب اُسی تربیت کی پیروی کرتے

چلے جائیں گے جو زندگی کے اوّلین لمحات میں مہیّا ہوئی ہے۔ اُس کے نفس پر انہی لوگوں کے حالات کا اثر پڑیگا جن میں اس نے تربیت اور نشو و نما پائی ہو۔ اس کے افکار کی بلند پروازیاں، سوچ بچار کے طریقے، میلانات کے راستے، رغبتوں کے میدان، اسرار الٰہیّہ کی طرف اشتیاق یا خواص طبعی کی نقاب کشائی کا خیال۔ ہر چیز کی کنہ حقیقت تک پہنچنے کا اہتمام یا سطحی مظاہر پر قناعت غرض اس قسم کے تمام اوصاف جو افکار سے متعلق ہیں در حقیقت ایسی امانتیں ہیں جو ماں باپ، قوموں، قبیلوں اور میل جول رکھنے والوں نے اس کے خزانۂ نفس میں اپنی طرف سے پہنچائی ہیں۔

جائے پیدائش، تربیت گاہ، مزاج کی افتاد، بدن کی ترکیب اور اسی قسم کی باقی طبعی خصوصیّات بھی انسان کے حالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ نفسیّاتی عوارض اور روحانی صفات میں یا تو بالکل ہوتا ہی نہیں یا ہوتا ہے تو صرف استعداد اور قابلیت پیدا کرنے تک محدود رہتا ہے اور وہ بھی بہت کمزور ہوتا ہے۔ تربیت کے اثرات اور میل جول رکھنے والوں اور شائستگی و تہذیب سکھانے والوں کے حالات و افکار نفس پر ایسا رنگ جما لیتے ہیں جس کے سامنے مندرجہ بالا طبعی خصوصیّات کا اثر تقریباً معدوم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ نئے نئے افکار اور دوسرے سے خود بخود پیدا ہونے والے خیالات، بلندی کی سیر کرانے والے اوصاف اور اوج سماوی کو نشانہ بنانے والی ہمّتیں ہی ہوتی

ہیں، جن کی وجہ سے بعد کے آنے والے اپنے پیشرووں پر سبقت لے جاتے ہیں اور جن کو غلطی سے اکتساب کے آثار سے الگ طبیعت کے تصرفات کا نتیجہ سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ یہ تمام خصوصیات کسب و اکتساب ہی کا نتیجہ اور اپنے لگائے ہوئے پودے ہی کا پھل ہوتی ہیں جو آہستہ آہستہ ظہور میں آتی ہیں۔ یہ انسان کے اپنے ہی اعضا و اذہان کی مصنوعات ہیں جو اس کے پیشرووں کے افکار و اعمال سے بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہیں اس لئے انسان عقل اور روحانی صفات کے لحاظ سے ایک صناعی عالم ہے یہ حقائق ایسے ہیں جنہیں نہ صرف عقلاً بلکہ عوام اور سادہ لوح طبیعتیں بھی شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گی یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جسمانی افعال ہمیشہ نفسانی ملکات اور روحانی ارادات کے تابع ہوتے ہیں اور اسی لئے بدن پر نفس یا روح ہی کو غلبہ و تسلّط حاصل ہے۔

اب میں اصل موضوع کو چھیڑنے سے پیشتر دین کے بارے میں ایک سچائی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں کسی کے لئے قابلِ انکار نہ ہو گی۔

دین اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ قانون ہے معلّم اور داعی بشر ہوا کرتا ہے۔ انسانی عقلیں اس پیغام یا قانون کو بشارت و انذار کا فریضہ ادا کرنے والے رسولوں اور پیغمبروں کی وساطت سے اخذ کرتی ہیں۔ جن لوگوں کو اللہ تعالےٰ اپنی وحی نہیں بھیجتا ہے، وہ اس قانون کو کوشش و اکتساب سے تعلیم و تعلّم کے

ذریعے حاصل کرتے ہیں اور تبلیغ، تدریس اور تعلیم و تلقین کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ پھر دلوں کی گہرائیوں میں سب سے پہلے اتر جانے والی چیز دین ہی ہے۔ دین ہی انسانی نفوس کو اپنے رنگ میں رنگ کر اس کے بعد کے ملکات اور عادات پیدا کرتا ہے اور ابدان کو ان چھوٹے بڑے کاموں کی مشق و ممارست کے لئے تیار کرتا ہے جو اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتے ہیں اور اس سے خود بخود سرزد ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے دین کو انسانی افکار پر اور افکار سے پیدا ہونے والے ارادوں پر محکم تسلّط و تصرّف حاصل ہے۔ اس لئے دین روح کا حاکم اور تدبیر بدن کے عمل میں اس کا پہلا رہنما ہے۔ یوں سمجھو کہ انسان پیدائش کے اولین لمحات میں ایک سادہ اور صاف تختی کے مثل ہوتا ہے۔ جس پر سب سے پہلا نقش دین کا ڈالا جاتا ہے اور پھر دین ہی کے ہدایت و رہبری کے ذریعے وہ باقی اعمال کی طرف خود بخود آمادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ نفوس پر دین کے سوا دوسرے عوامل کا اثر شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی لامذہب اپنے دین کو خیرباد کہہ دے تب بھی اسے ان اوصاف و اخلاق کو چھوڑنے کی قدرت ہرگز حاصل نہ ہوگی جو دین نے اس میں پیدا کر دیئے ہیں۔ ان اوصاف و اخلاق کے نقوش اس کے اخلاق و عادات میں اسی طرح نمایاں رہیں گے جس طرح زخم کے مندمل ہو جانے کے بعد اس کا نشان باقی رہ جاتا ہے۔

ان تمہیدات کے بعد اب ہماری بحث کا موضوع ملّت مسیحیہ اور ملّتِ

اسلامیہ کا موازنہ ہے۔ یہ ایک ایسا طویل موضوع ہے جس کا دامن تفاصیل سے بھرا پڑا ہے لیکن یہاں ہم اس کا صرف ایسا اجمال پیش کریں گے جو خود بخود تفصیل کی طرف رہنمائی کریگا۔ ملتِ مسیحیہ کی بنیاد، مصالحت یا عدم تشدد، سہل انگاری اور آسان پسندی پر ہے، اس لئے اس مذہب میں قصاص اور بدلہ لینے کے خیال کی نفی کی گئی ہے۔ حکومت اور اقتدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی ہے۔ اور دنیا اور اس کے مال و متاع کو چھوڑنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اپنے پیروؤں کے لئے اس مذہب کی نصیحت یہ ہے کہ وہ ہر اُس حاکم کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھیں جس کے ہاتھ میں ان کی عنانِ حکومت آگئی ہو۔ یہ مذہب کہتا ہے کہ بادشاہوں اور حاکموں کے مال و دولت کو ان پر چھوڑ دو اور نہ صرف شخصی اور قومی جھگڑوں بلکہ مذہبی تنازعوں سے بھی بالکل الگ تھلگ رہو۔ انجیل کی وصیت ہے کہ "جو تمہارے دائیں رخسار پر تھپّڑ مارے اس کو اپنا بایاں رخسار بھی پیش کردو" اسی طرح انجیل یہ کہتی ہے کہ "بادشاہوں کی حکومت اجسام پر ہوتی ہے جو فانی ہیں حقیقی اور پائیدار تصرّف ارواح پر ہوا کرتا ہے جو تنہا ذاتِ الٰہی کے لئے مخصوص ہے"۔ اب جو شخص اس دین کے بنیادی اصولوں سے واقفیت حاصل کریگا اور ہماری تمہید کے مندرجہ بالا مقامات کو بھی ذہن میں رکھے گا کہ افکار پر دین کو زبردست تصرّف حاصل ہے اور افکار ارادہ کی تخلیق میں خاص دخل رکھتے ہیں اور اسی کے زیرِ اثر جسمانی حرکات سرزد ہوتی ہیں تو اسے اس صلح و آشتی کے دین کو ماننے والوں کے کردار و اعمال دیکھ کر یقیناً بڑا تعجب ہوگا اس

کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے گی جب وہ دیکھے گا کہ یہ لوگ فخر و غرور میں سامانِ تعیش مہیا کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے کتنے بے چین ہیں۔ حیاتِ فانی کی لذتوں سے متمتع ہونے کی ان کے ہاں کوئی حد مقرر نہیں۔ دنیا کے ممالک کو فتح کرنے اور دُور دراز سرزمینوں پر قبضہ کرنے میں ان کی کوششیں حد سے تجاوز کر گئی ہیں۔ وہ آئے دن حرب و ضرب کے نت نئے فن ایجاد کرتے اور مہلک آلاتِ حرب کی ساخت میں نئی نئی اختراعیں کرتے رہتے ہیں۔ ان فنون اور آلات کو وہ آپس میں بھی اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح اغیار کے خلاف ان سے کام لیتے ہیں۔ لشکروں کی تنظیم و ترقی اور میدان جنگ میں ان کے لڑانے کی تدبیروں پر ان کا دماغ برابر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے جنگ اور کشت و خون کے نظام کے استحکام میں اپنی عقلوں کو مدتوں مصروف رکھا ہے۔ اور لڑائی کو ایک باقاعدہ اور وسیع فن بنا لیا ہے۔ حالانکہ ان کے دینی اصول کے مطابق دوسروں کی جاگیر پر نظر رکھنا تو کجا اپنی جاگیروں کی حفاظت میں اہتمام دکھانا بھی جائز نہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کی بنیاد غلبہ اور شوکت کی طلب، فتوحات کے حصول، قوت و اقتدار کی توسیع اور قانونِ اسلام کے سوا باقی ہر قانون کا مقابلہ کرنے کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ اسلامی آئین کے مطابق ہر اس تسلط کو خیر باد کہنا چاہیئے جس کے نظام کو ہاتھ میں لینے والا احکامِ شریعت کے نافذ کرنے پر قادر نہ ہو۔ ملّتِ

اسلامی کے اصول پر غور کرنے اور اس کی کتاب مُنزّل کی ایک بھی سورۃ پڑھنے والے کا اس نتیجہ پر پہنچنا یقینی ہے۔ اسلام پر ایمان لانے والوں کے لئے قوت آزما اقوام کی صفِ اوّل میں کھڑا ہونا ضروری ہے اور مہلک آلات کی ایجاد و اختراع، علوم عسکریہ کے تنظیم و ترتیب اور طبیعات، کیمیا، جرّ اثقال اور ہندسہ وغیرہ علوم میں جو قوانین حرب میں امداد دیتے ہیں ان کو حاصل کرنا اور اس سلسلے میں مہارت کے لحاظ سے باقی اقوام سے پیش پیش رہنا مسلمانوں کی ایک اہم اور طبعی ضرورت ہے۔ جس شخص نے بھی آیت کریمہ وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ کو غور سے پڑھا ہو گا اس نے اس بات کا یقین کر لیا ہو گا کہ جو شخص دین کی تعلیمات میں رنگا گیا اس پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے کی محبت کا رنگ چڑھ گیا اور اب وہ نہ صرف دوسروں کے غلبہ سے بچنے کے لئے حفاظتی تدابیر اور دفاعی افواج کا پورا اہتمام کریگا بلکہ غلبہ اور عزّت کے راستوں کو آسان بنانے کے لئے وسائل کی تلاش اور اقتدار تک پہنچنے کی بھی ہر ممکن کوشش کریگا۔ جو شخص یہ دیکھے کہ شریعت اسلامیہ نے ہر قسم کی شرط بازی پر پابندی لگائی ہے مگر گھوڑ دوڑ اور تیر اندازی کو اس سے مستثنےٰ رکھا ہے، اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ فنونِ عسکریہ کو سیکھنا اور ان میں مہارت پیدا کرنا شارع اسلام کو کتنا مرغوب ہے۔

اِن تمام حقائق کے باوجود جب وہ اس مذہب کے آج کل کے پیروؤں کے حالات پر نظر ڈالے گا تو اس کی آنکھوں کے سامنے حیرت و استعجاب

کی ایک ظلمت چھا جائے گی کیونکہ وہ دیکھے گا کہ یہی قوم قوت و طاقت حاصل کرنے میں سست گام اور لوازمِ اقتدار طلب کرنے میں سہل انگار ہے نہ اسے فنونِ جنگ میں مہارت حاصل کرنے کی فکر ہے اور نہ نئے آلاتِ حرب ایجاد کرنے کا خیال۔ جن چیزوں کو ایجاد کرنا ان کا پہلا فرض تھا، انہی میں دوسری قومیں ان سے بہت آگے نکل گئی ہیں۔ جن فنون و آلات کی انہیں ضرورت ہے، انہی کے لئے آج وہ دوسری قوموں کے دستِ نگر ہیں بلکہ ان کی ایک کثیر تعداد مخالفین کے قبضۂ اقتدار میں آ کر ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہی ہے اور انہیں چار و ناچار ان کے احکام کی پابندی کرنی پڑ رہی ہے جو شخص ملتِ اسلامی اور ملتِ مسیحی کا موازنہ کرے گا وہ حیران ہو گا کہ توپ، مشین گن اور ٹینک وغیرہ کی ایجاد اسلامیوں سے قبل مسیحوں کے ہاتھوں کس طرح عمل میں آئی۔ مارٹین کی بندوق مسیحی ممالک میں اسلامی ممالک سے پہلے کس طرح رائج ہو گئی اور قلعوں کی مضبوطی، جہازوں کی ہتھیار بندی کی تدابیر اور سمندروں کی کنجیاں مذہب صلح و آشتی کے پیرووں کے ہاتھ کیسے آ گئیں۔ غلبہ و اقتدار کا اعتقاد رکھنے والوں کو یہ سعادت کیوں نصیب نہ ہوئی۔

ایک صاحبِ نظر اپنی پوری عقل و رائے کے باوجود حیرت کے سمندر میں کیوں غوطہ زن نہ ہو گا۔ اور حقیقت تک پہنچنے میں بے بسی کا اظہار کیوں نہ کرے گا؟ صدیاں گزر گئیں۔ فلک پیر نے بیشمار چکر لگا لئے۔ کیا یہ طویل عرصہ

اس بات کے لئے کافی نہ تھا کہ ہر ایک مذہب کے معتقدین اپنے مذہبی اعتقادات میں اور زیادہ مضبوط ہو جائیں ؟ کیا یہ ساری مدت ایسی گزر گئی کہ دونوں مذہبوں کے پیرووں نے اپنے اپنے مذہب کے عقائد کو بالائے طاق رکھ کر نئے قوانین پر عمل کیا ؟ کیا نصاریٰ نے اپنے دین میں صرف شریعتِ موسوی پر عمل کرنے اور یوشع بن نون کی سیرت کی پیروی کرنے پر اکتفا کی ؟ مسلمانوں کے سامنے ان کے منبروں پر جو خطبے اور درس دیئے جاتے ہیں کیا ان میں دانستہ یا نادانستہ انجیل کی بعض آیتیں ملائی گئیں ؟ کیا وہ مسلمان معلّم اور شریعتِ اسلامیہ کے مبلّغ جو مجالس درس میں بیٹھ کر تعلیماتِ اسلام کی تبلیغ کا دعویٰ کرتے ہیں، انجیل کی چند آیتوں کے سکھانے اور انہی کی تعلیم دینے کے دلدادہ ہو گئے ؟ کیا دونوں مذہبوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنّت جاریہ تبدیل ہو گئی ؟ کیا طبیعت اور فطرت کے طریقے ان دونوں مذاہب والوں کے لئے اُلٹے چلنے لگے ؟ کیا اجسام نے ان دونوں قوموں کے ارواح پر غلبہ حاصل کر لیا ؟ کیا ارواح کی تدبیر فکر و خیال کے سوا کسی اور عامل کے سپرد ہو گئی ؟ کیا افکار مذہب کے تسلّط سے آزاد ہو گئے ؟ کیا نفوس دین کی رسوم اور اثرات کو قبول کرنے سے انکار کرنے لگے حالانکہ ان کا سب سے پہلا حاکم اور ان میں سب سے قوی و مؤثر دین ہی تھا ؟ کیا علّتوں کے وجود کے ساتھ معلول کا وجود لازم نہیں رہا ۔ کیا اسباب اور مسبّبات کے باہمی علاقے کٹ سکتے ہیں ؟ پھر وہ کونسی چیزیں ہوں گی ۔

جو عقل کو ان پوشیدہ رازوں کے کھولنے اور ان مشکل معموں کے حل کرنے میں مدد دے سکیں گی؟

اس اختلافِ نتائج کو نسلی اختلاف کی طرف بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دونوں مذہبوں کے بہت سے پیرو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ممالک کے اختلاف کی طرف بھی اس کی نسبت غلط ہے کیونکہ دونوں فرقوں کے بیشتر افراد ممالک کے طبیعی حالات میں ایک دوسرے کے مثل اور ایک دوسرے کے ہمسایہ ہیں۔ کیا مسلمانوں سے اپنے مذہبی نشو و نما کے ابتدائی دور میں وہ وہ کارنامے صادر نہیں ہوئے جنہوں نے آنکھوں کو خیرہ اور عقلوں کو متحیر کر دیا تھا؟ کیا مسلمانوں میں وہ ایرانی، عرب اور ترک شہسوار نہیں گزرے جو ان ممالک کو زیر و زبر کر کے ان کے مسندِ امارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے پاس توپیں اور وہ بارودی آلات تھے جنہیں دیکھ کر عیسائی گھبرا اُٹھے تھے اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں سخت پریشان تھے، انگریز مصنف ملکم سرجم اپنی تاریخ ایران میں لکھتا ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان کی لڑائیوں میں توپوں سے کام لیا تھا اور اسی وجہ سے ہندوؤں کو اُس سے شکست کھانی پڑی تھی۔ اس زمانہ کے عیسائیوں کو ان آلات کی ہوا تک بھی نہ لگی تھی۔

زمانے کی وہ کونسی امداد تھی جس نے عیسائیوں کے ہاتھ کو پکڑ کر انہیں اُس

محاذ پر پہنچایا جو ان کے دینی اصول کی سرحد سے بہت دور تھا ؟ اور دورِ فلک کا وہ کونسا دھکا تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے دین کے اوّلین فرض —— جہاد کے وسائل سے پیچھے ہٹا دیا ؟ حیرت اور تعجب کا مقام ہے ! ان غلط نتائج کے کچھ نہ کچھ اسباب تو ہوں گے ! ہاں ضرور ہیں اور تفصیلات میں جائیں تو بہت طویل ہیں لیکن ہم اپنے وعدے کے مطابق یہاں اجمال ہی سے کام لیں گے۔

دراصل دینِ مسیحی کے سائے جن لوگوں پر پھیل گئے تھے اور جن لوگوں کو اس کا پیغام پہنچایا گیا تھا وہ رومن ایمپائر کے یورپین باشندے تھے۔ اس دین کو قبول کرتے وقت ان کے پاس وہ عقائد، آداب، اخلاق، عادات، علوم اور پرانے قوانین کے مجموعے موجود تھے جو انہیں اپنے سابقہ مذہب سے بطورِ ورثہ ملے تھے۔ دینِ مسیحی نے آکر ان پر کسی پُرشکوہ انداز میں نئے مسائل و قوانینِ شریعت نافذ نہیں کیے بلکہ محض ان کی عادات اور عقول و افکار کی طرف مصالحت کا ہاتھ بڑھایا اور ان کے خیالات کو مطمئن کرنے اور ان کے جذبات و تصورات کے مخفی گوشوں تک پہنچنے پر ہی اکتفا کی۔ اسی طرح نئی تعلیمات نے ان کے پرانے لباس کو جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملا تھا، اتارا نہیں بلکہ اُس کے نقش و نگار اور تزئین و آرائش میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ پرانے زمانے میں انجیل کے صلح و سلامتی کا پیغام دینے والے صحیفے عام لوگوں کے ہاتھوں میں کم پہنچتے تھے، صرف روحانی پیشوا اور پادری ان کو اپنے کتب خانوں کی زینت

بنایا کرتے تھے پھر جب رومن کیتھولک پادریوں نے قانون سازی کا منصب اپنے لئے مقرر کیا اور صلیبی رجحانات کی داغ بیل ڈال کر انہیں مذہبی رنگ دیا تو صلیبی محاربات نے بھی مذہبی عقائد کی جگہ لے لی اور انہیں بھی وہی درجہ حاصل ہو گیا۔ جو دیگر مذہبی اصولوں کو حاصل تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا دَور آیا۔ یورپ میں عیسائیوں کے عقائد متزلزل ہو گئے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور ان میں ایسے خیالات و افکار پھیل گئے جنہوں نے دینی تسلّط کے ساتھ ٹکّر لی۔ ان کے آباؤ اجداد نے ان کے وجود میں جو چنگاریاں چھوڑی تھیں وہ سُلگتے سُلگتے بے پناہ شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے جس طرح دوسرے فنون میں توسیع و ترقّی کی اسی طرح فنونِ حرب میں بھی رخشِ فکر کو دوڑایا اور شہسواری کی داد لی اور حرب و دفاع کے مختلف آلات ایجاد کر کے میدانِ جنگ میں غلبہ حاصل کیا۔

مسلمانوں نے اپنے مذہبی دورِ ارتقا میں جو کامیابیاں دیکھیں وہ تفصیل سے مستغنی ہیں انہوں نے حرب و ضرب کے تمام کمالات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اور جنگی علوم و فنون میں باقی تمام اقوام سے گوئے سبقت لے گئے لیکن بعد میں کچھ ایسی قومیں دین کا لباس پہن کر سامنے آئیں جنہوں نے دین میں بدعت و ضلالت پیدا کر کے اصولِ دین میں ایسے مسائل شامل کر لئے جو درحقیقت اس میں شامل نہ تھے جبریہ کے مسائل نے اذہان میں وہ رخنہ

ڈالا جن سے مسلمانوں کی قوتِ فکر مسلوب ہو گئی۔ اس کے علاوہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں زنادقہ نے نئے خیالات پھیلائے۔ ادھر سوفسطائیہ نے وجود کے مظاہر سے انکار کر کے تمام موجودات کے متعلق یہ تصور عام کر دیا کہ وہ حقائق سے بالکل خالی اور محض خیالات کی تخلیق ہیں جو مجسّم بن کر نظر کو فریب میں مبتلا کرتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ جھوٹے راویوں نے من گھڑت احادیث نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیں اور انہیں احادیث کی کتابوں میں شامل کر دیا۔ ان احادیث کے مہلک اثرات بہت دُور رس ثابت ہوئے اور انہوں نے ہمتّوں میں کمزوری اور عزائم میں فتور پیدا کر دیا۔ بلاشبہ اہلِ حق نے تحقیق کر کے صحیح اور موضوع احادیث کے درمیان تفریق قائم کر دی اور ہر موضوع حدیث کے متعلق وضع کی تصریح کر دی مگر یہ کوشش کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ عوام میں اس کے اثرات پھیل چکے تھے اور تعلیم کے طریقوں میں اتنا نقص پیدا ہو گیا تھا کہ دین کے جو سچّے اصول نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرامؓ نے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے چھوڑے تھے ان کو حاملینِ شریعت عوام تک پہنچانے سے قاصر تھے۔ صحیح اور حقیقی بنیادوں پر دین کا مطالعہ صرف مخصوص حلقوں اور چند کمزور افراد کی جماعت تک محدود تھا۔ غالباً ان کو جمود و خمود اور رجعتِ قہقہری کرنے کے یہی اسباب ہیں اور یہی وہ امراض ہیں جن کی صعوبتیں ہم آج تک برداشت کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے نجات دے اور سلامت رکھے۔

پھر بھی یہ بات یاد رہے کہ یہ عوارض جو دین پر غالب آگئے ہیں اور اگرچہ لوگوں کے ذہنوں پر ایک غلیظ پردہ کی شکل میں چھا چکے ہیں، لیکن حقیقی اعتقادات سے ابھی مسلمان یکسر محروم نہیں ہوئے اور اسی لئے ان نئی بدعات اور حقیقی اعتقادات کے درمیان ہمیشہ ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش جاری رہتی ہے۔ حق و باطل کی معرکہ آرائی اسی طرح جاری ہے جس طرح مرض اور طبیعت تدبرۂ بدن میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ چونکہ دین حق کا رنگ وہ پہلا رنگ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے نفوس کو رنگ دیا ہے اور ان عارضی بادلوں کے درمیان بھی دینِ حق کی بجلی کی چمک لگاتار اپنا جلوہ دکھا رہی ہے اس لئے ضرور بالضرور ایک دن آئے گا جب صداقت کی روشنی پھر پھیلے گی اور غفلت اور جہالت کے بادل چھٹ جائیں گے خصوصاً جب کہ صبح و شام مسلمانوں میں قرآن کی تلاوت جاری ہے وہ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب جو سچی رہنما اور امور مسلمین کی صحیح علمبردار ہے جس کا حکم ہے کہ اپنے ممالک کی حفاظت کرو اور اپنی ولایات اور صوبوں کی حمایت کر کے ان کو ظالموں اور تعدّی کرنے والوں کے دستبرد سے بچالو جس کا حکم ہے کہ ذات پات کی تمیز کے بغیر جہاں سے بھی ہو سکے اپنی حمایت کے لئے زور آور سپاہی مہیا کرتے رہو۔

ان حقائق کی روشنی میں ہمیں پورا پورا یقین ہے کہ مسلمان ایک دفعہ پھر اپنی ترقی کے اس درجے کو حاصل کریں گے جو انہوں نے دین و ملت کے ابتدائی

دورِ ارتقا میں حاصل کی تھی اور وہ جوش و خروش سے اٹھ کر ان اسباب کی واپسی کا مطالبہ کریں گے جو زمانے کے ہاتھوں نے ان سے چھینے۔ اس طرح وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں معروفِ پیکار ہونے، دعوتِ حرب دینے اور دشمن پر حملہ کرنے میں باقی اقوام پر سبقت حاصل کریں گے اور اپنے نفوس کو ذلّت اور ملّت کو خواری و بربادی سے بچالیں گے۔ وَاِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ۔

قضا و قدر ہم نے کسی گزشتہ اشاعت میں سنّتِ الٰہی کے اس عام قانون کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جو عقائد دلوں میں راسخ ہو جاتے ہیں وہ جسمانی اعمال و افعال کو اپنے مضبوط تصرّف میں لے لیتے ہیں۔ اعمال میں صلاح یا فساد جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے اس کی اصلیّت عقیدے کی صلاح یا فساد میں مضمر ہوتی ہے۔ بسا اوقات ایک ہی عقیدہ مختلف افکار کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور دیگر عقائد اس کی متابعت میں خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان عقائد کے اثرات بدن پر ان اعمال کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جن کا اثر نفس کے ساتھ گہری مناسبت رکھتا ہے۔

بسا اوقات کوئی ضابطہ اصولِ خیر اور قواعدِ کمال سے تعلّق رکھتا ہے لیکن جب اُسے شریعت کی تبلیغ یا تعلیم کے لئے نئے نفوس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ اشتباہ میں پڑ کر اس کے حقیقی مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ اس کی حقیقت کو سمجھنے کی بجائے ایسے معنی پر محمول کر لیتے ہیں۔

جو شارع کی منشا کے خلاف ہیں یا وہ پہلے ہی سے چند فاسد اوصاف اور باطل عقیدوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور جب یہ نیا عقیدہ اور اُصول ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو یہ پرانے خیالات کے ساتھ مل کر بالکل ایک نئی چیز بن جاتی ہے بہر حال دونوں صورتوں میں اس کی اصلی شکل تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کا اثر اپنے اصل منشا کے برخلاف ہوتا ہے بلکہ لبسا اوقات اسی کج فہمی کی بنا پر اس پہلے عقیدے کے بعد یکے بعد دیگرے اور بہت سے فاسد عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جو بہت سے ناپسندیدہ اعمال کا سبب بنتے ہیں۔ معتقد کو اس بات کا شعور بھی نہیں ہوتا کہ اعتقاد پیدا کیسے ہو گیا یا اسے کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر جو لوگ ظواہر کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں وہ اس فساد کو اُسی اعتقاد اور اسی قاعدہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ غالباً ادیان کے بعض اصول و قواعد میں تحریف و تبدیلی اسی ذہنی انحراف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور عموماً ہر دین میں بدعت کی جڑ یہی غلط فہمی ہے۔ لبسا اوقات عقیدہ کا یہ انحراف اور اس کے بعد آنے والی بدعات طبیعتوں اور اعمال کے قبائح پیدا کرنے کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ اور اس عقیدہ میں مبتلا ہونے والے شخص یا قوم کو ہلاکت کی طرف پہنچا دیتی ہیں۔ بے خبر لوگ کسی خاص دین کو مورد طعن ٹھیرانے اور عقائد حقہ کو بُرا بھلا کہنے کے لئے اس عقیدہ کو بہانہ بنا لیتے ہیں اور اس کے بعض سادہ لوح پیروکاروں کے طرزِ عمل کو سند کے طور

پر پیش کرتے ہیں۔

ایسا ہی ایک عقیدہ قضا و قدر کا ہے جو اسلام کے بنیادی عقائد میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یورپ کے بعض ناسمجھوں نے بہت کچھ لایعنی باتیں کی ہیں۔ ان کے گمان میں مسئلہ قدر قوم کے نفوس میں جاگزیں ہوتے ہی ان سے ہمّت اور قوت چھین لیتا ہے اور ان میں کمزوری اور ذلّت کی جڑیں مضبوط کر دیتا ہے ان لوگوں نے مسلمانوں میں چند عیوب نکالے اور کچھ ناپسندیدہ اخلاق کو ان کی طرف منسوب کر کے قضا و قدر کو ان کا علت العلل قرار دیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "مسلمان فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ حربی اور سیاسی قوّتوں میں دوسری سب قوموں سے پیچھے ہیں۔ فاسد اخلاق ان میں عام ہو چکے ہیں وہ جھوٹ، نفاق، خیانت، باہمی حسد اور بغض و عناد کے عادی ہیں۔ ان میں تشتّت و افتراق پیدا ہو گیا ہے نہ ان کو اپنے موجودہ حالات کی خبر ہے اور نہ آئندہ پیش آنے والے حوادث کا کوئی اندازہ۔ وہ اپنے نفع و ضرر کو سوچنے سے بالکل غافل اور موجودہ زندگی پر قانع ہیں جس میں کھانے پینے اور سونے کے لئے کافی موقع ملتا ہے۔ وہ دوسری اقوام کے ساتھ کسی فضیلت میں مقابلہ کرنا نہیں چاہتے ہاں جب کبھی کوئی مسلمان اپنے بھائی کو ضرر پہنچانے کا موقع پاتا ہے تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا یہ آپس کے جھگڑوں اور نبرد آزمائیوں میں مصروف ہیں اور دوسری قومیں ان کے پیچھے کھڑی انہیں لقمہ کر کے کھائے جا رہی ہیں مسلمان

ہر مصیبت پر راضی اور ہر حادثہ کو لبیک کہنے کے لئے تیار ہیں۔ اپنے ٹوٹے پھوٹے گھروندوں میں جمود کی زندگی بسر کرنا اور دن کو چرپایوں کی طرح چراگاہوں میں چل پھر کر رات کو گھر پہنچنا ان کا عزیز ترین مشغلہ ہے۔ ان کے امراء اور نواب لہو و لعب اور خواہشات نفسانیہ کی تکمیل میں اپنی زندگیاں صرف کر دیتے ہیں۔ اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش نہیں کرتے جو ان پر ڈالی گئی ہیں اور جنہیں صحیح معنوں میں پورا کرنے کے لئے عمر نوح بھی کافی نہیں۔ وقت گزارنے کے لئے ان لوگوں نے فضول مشاغل اختیار کر لیئے ہیں اور ان پہ مال و دولت کے ڈھیر بے دردی سے خرچ کئے جا رہے ہیں ان کے اخراجات حد سے بڑھ کر اسراف اور فضول خرچی کی حدود میں داخل ہو گئے مگر ان اخراجات میں ایسی کوئی مد نہیں جس سے ملک اور قوم کو بھی کوئی نفع پہنچ سکے۔ ایک دوسرے کو رسوا کرنا ان کا شیوہ ہے اور ذاتی مصلحتوں کے لئے قومی مصلحتوں کا خون کرنا ان کی عادت راسخہ بسا اوقات دو امیروں یا دو نوابوں کی باہمی چپقلش قوم کی قوم کو تباہ کر دیتی ہے۔ ہر امیر اپنے مدمقابل کو زک دینے کے لئے اپنے ہمسایہ حاکم سے امداد طلب کرتا ہے۔ اجنبیوں کو ان کی ختم ہونے والی طاقت اور مہلک کمزوری کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ کوئی لشکر یا اسلحہ جمع کرنے کی زحمت اٹھائے بغیر دونوں کے ممالک اور جاگیروں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ خوف اور بزدلی ان کے دلوں

پر بری طرح چھا گئی ہے۔ اگر کہیں پتہ بھی کھڑکتا ہے تو ان کا دل دہشت کے مارے دھڑکنے لگتا ہے اور کوئی آہستہ سے ان کے بدن کو انگلی بھی لگا دیتا ہے تو وہ درد سے چیخ اُٹھتے ہیں۔ شوکت و اقتدار کی دوڑ میں قوموں کے دوش بدوش جد و جہد کرنے سے وہ عاجز ہیں۔ دیکھ رہے ہیں کہ ان کی ہمسایہ قومیں بلکہ وہ لوگ جو کبھی ان کے محکوم رہ چکے تھے آج ان سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اپنے اعمال واندوختہ مفاد کے لئے ان پہ فخر کر رہے ہیں مگر ان سے یہ نہیں ہو سکتا کہ خود بھی مقابلہ کی ہمت کریں اور اپنے دین کے احکام بجا لائیں جب ان کی برادری کے کسی فرقے پر مصیبت آجاتی ہے اور کوئی مخالف ان پر ظلم و تعدی کرتا ہے تو وہ اُن کے مصائب کو کم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے اور اس کی امداد کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے نہ غیرت کو زندہ کرنے، حمیت کو بیدار کرنے، کمزوروں کی امداد، اور طاقت والوں کی بغاوت کو کچلنے اور کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ان کے ہاں بڑی بڑی قومی جماعتیں موجود ہیں۔"

مسیحی اقوام اس طرح مسلمانوں کی طرف ان صفات اور عادات کو منسوب کر رہی ہیں ان کے خیال میں ان کی کمزوریوں کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان قضا و قدر کے قائل ہیں اور اپنی تمام مہموں اور اعمال و افعال کو قدرتِ الٰہیہ کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک مسلمان اس عقیدہ پر قائم رہیں گے ان کی کوئی کل سیدھی نہیں رہے گی انہیں کبھی عزت نصیب نہیں ہو سکتی وہ کبھی

عزت اور بزرگی کو حاصل نہ کرسکیں گے وہ کبھی اپنا حق لینے کے قابل نہ ہوں گے اُن سے کبھی کسی ظلم و جور کی مدافعت نہ ہوگی نہ وہ کبھی اپنی سلطنت و اقتدار کو ترقّی دینے اور اپنی حکومت کی امداد کرنے کے لئے اُٹھ سکیں گے ہمیشہ ان کے نفوس میں کمزوری سرایت کرتی رہے گی اور ان کے طبائع میں ضعف پیدا کر کے فساد و زوال کے راستے سے انہیں ختم کردے گی (اَلعیَاذُ بِاللہ) کچھ آپس کی لڑائیوں میں مشغول ہو کر ختم ہو جائیں گے اور جو بچ جائیں گے ان کا صفایا دشمنوں کے ہاتھوں ہو جائے گا۔

فرنگیوں کے خیال میں قضا و قدر کا عقیدہ جبریہ عقیدہ کے مترادف ہے کہ انسان اپنے سب افعال میں مجبور محض ہے اور اسی لئے انھوں نے مسلمانوں کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ عقیدہ قضا کی وجہ سے اپنے آپ کو فضا میں معلّق پر کی طرح سمجھتے ہیں جو ہوا کے رحم و کرم پر ٹھہرا ہے۔ ہوا جس طرف کو چلتی ہے اُسی طرف کو اُڑا لے جاتی ہے۔ جب کبھی کسی قوم کے دلوں میں یہ اعتقاد محکم ہوا کہ ان کو اپنے قول اور عمل میں کسی قسم کا اختیار نہیں نہ وہ کسی حرکت یا سکون کے مالک ہیں اور یہ کہ تمام چیزیں ایک جابرانہ قوّت اور قاہرانہ اقتدار کے حسب خواہش وجود میں آتی ہیں تو ان کے قویٰ مفلوج و معطّل ہو کر رہ جائیں گے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سوچنے کے لئے جو نفسانی آلات' اعمال و ظائف کے لئے جو جسمانی اعضا عطا فرمائے ہیں۔ ان کے فوائد سے وہ محروم رہ جائیں گے ان کے

دلوں سے جدوجہد اور کسب و تحصیل کے جذبات فنا ہو جائیں گے اور اس کے بعد ان کے لئے عالم وجود میں رہنے کی بجائے عالم عدم کی سیر کرنا زیادہ مناسب ہو گا۔

بیشک فرنگیوں کا ایک گروہ انہی خیالات میں مبتلا ہے۔ بلکہ مشرق کے بعض ضعیف العقل اور دماغی مفلس بھی قضا و قدر کے مسئلہ کو اسی انداز پہ سمجھتے ہیں مگر میں بلا خوف تردید یہ اعلان کرتا ہوں کہ یہ خیال قطعاً غلط سراسر غلط اور سرتا پا وہم کا مرکب ہے۔ یہ خدا اور خدا کے بندوں ـــــ مسلمانوں ـــــ پر افترا ہے۔ بہتان ہے اس وقت دنیا میں کوئی مسلمان سُنّی، شیعہ، زیدی، اسمٰعیلی، وہابی یا خارجی ایسا نہیں پایا جاتا جو مذہب جبر کا قائل ہو اور اپنے آپ کو یکسر مسلوب الاختیار اور بے دست و پا سمجھتا ہو۔ یہ تمام مسلمان فرقے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو اپنے افعال و اعمال پر اختیار بخشا ہے اور اسی کے مطابق وہ ان سے حساب لے گا۔ انہیں یقین ہے کہ خیر و برکت دعوت دینے اور نجات و فلاح کا راستہ بتانے والے تمام خداوندی احکام کی تعمیل کا جو مطالبہ ان سے کیا جا رہا ہے وہ اسی لئے ہے کہ انہیں اپنے افعال پر اختیار دیا گیا ہے۔ ان کا یہی عقیدہ ہے کہ اس قسم کے اختیار کی وجہ سے انہیں قانونِ شریعت کا مکلّف بنایا گیا ہے اور اسی اختیار کے ذریعے سیاست اور انصاف کا قانون مکمّل ہوتا ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی گزرا ہے جو خیال کرتا تھا کہ انسان

اپنے تمام افعال میں مجبور محض اور اختیار سے یکسر خالی ہے۔ ان کے نزدیک جبڑوں کی اس حرکت میں جو کھاتے وقت کوئی شخص چبانے اور کھانے کی خاطر عمل میں لاتا ہے اور اس حرکت میں جو کڑاکے کے جاڑے میں سردی کی شدت کے باعث دانتوں کے بجنے سے پیدا ہوتی ہے مجبوری اور بے اختیاری کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں یہ فرقہ جبریہ کے نام سے مشہور تھا۔

اس فرقہ کے مذہب کو تمام مسلمان مغالطوں اور سفسطوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ قضا و قدر کا عقیدہ جبر کے عقیدہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس عقیدہ سے وہ نتائج پیدا نہیں ہوتے جو ان وہم میں پڑے ہوئے لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں۔

قضا و قدر کا عقیدہ ایسا ہے جس کی تائید قطعی دلائل کرتے ہیں اور جس کی طرف انسانی فطرت عقل کی رہنمائی کرتی ہے۔ ہر سوچ سمجھ والے فرد کے لئے یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ ہر حادثہ کے لئے قریبی زمانے میں کسی سبب کا ہونا ضروری ہے اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اُس کے سامنے ہے کہ وہ صرف ان ہی اسباب کو معلوم کر سکتا ہے جو اس کی نظروں کے سامنے ہیں۔ اس سے گزشتہ اور پوشیدہ اسباب کا علم صرف اس ذات کو ہے جس نے اس نظام کو ایجاد کیا اور ان تمام اسباب کو بعد کے آنے والے واقعات میں باری تعالیٰ کی تقدیر اور اندازے کے مطابق دخل ہوتا ہے۔ خود انسان کا ارادہ بھی اسباب کی زنجیر کی ایک کڑی ہے کیونکہ ارادہ خود ادراک اور تصوّر کے آثار و نتائج میں سے ایک ہے ادراک

اُس انفعال اور اثر پذیری کا نام ہے جو حواس پر خارجی اثرات کے طاری ہونے اور فطرت کی ضروریات اور حاجات کا احساس کرنے سے نفس کو حاصل ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں رونما ہونے والے حادثات پر انسانی فکر اور ارادہ کو وہ تسلط حاصل ہے جس سے کوئی عاقل تو کجا احمق اور بیوقوف شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اسباب جو مختلف حادثات اور واقعات میں کارفرما بظاہر نظر آتے ہیں ان سب کا مبدا اور سرچشمہ اُس ذات کے ہاتھ میں ہے جو کائنات کے عظیم الشان نظام میں تصرف کر رہا ہے جس نے تمام اشیاء کو اپنی حکمت کے مطابق پیدا کیا اور ہر حادثہ اور واقعہ کو اپنے ہم مثل سبب کے اسی طرح تابع بنایا ہے جس طرح جزا شرط کی تابع ہوتی ہے۔ یہ قانون عالم انسانی میں اور زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

یہ فرض بھی کر دیا جائے کہ کوئی جاہل گمراہ ہو کر عالم کو پیدا کرنے والے ایک خدا کے وجود سے منکر ہو جائے تب بھی اس کے لئے بشری ارادات میں طبعی عوامل اور زمانے میں رونما ہونے والے حادثات کے اثر انداز ہونے سے انکار کرنے کی گنجائش نہ ہوگی۔ کسی انسان کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ اس قانون سے جو اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق کی فطرت میں جاری کر دیا ہے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرلے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ حقائق اشیاء کا کھوج لگانے والے ابتدائی طالب علم اس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ بعض یورپین فلاسفہ اور علماء سیاست نے قضاء و قدر

کے عقیدے کے سامنے سپر انداز ہونے کا اعتراف کر لیا ہے اور اس کے تسلط کو ثابت کرنے کے لئے لمبے چوڑے دلائل بیان کئے ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی آراء اور افکار سے شہادت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

واقعات اور روایات کے ذکر کے علاوہ علم تاریخ کا ایک شعبہ اور ہے جس کے مباحث پر ہر قوم کے علما نے اپنے اپنے دور میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ شعبہ اجتماعیات کہلاتا ہے اس میں قوموں کی ترقی و تنزل کی رفتار کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس کے اسباب و نتائج معلوم کئے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے حادثات کی طبعی کیفیات اور خواص بیان کئے جاتے ہیں اور ان تغیرات کا پتہ چلایا جاتا ہے جو ان کی وجہ سے قوموں کی عادات و اخلاق، افکار، باطنی احساسات اور وجدان میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان لوازم سے بحث کی جاتی ہے جو ان تبدیلیوں کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ یعنی حکومتوں اور سلطنتوں کی بنا اور قوموں کا ارتقا ان کے نشاناتِ زندگی کا زوال اور ان کی فنا۔

یہ فن بہت جلیل القدر اور بہت مفید خیال کیا جاتا ہے اس کے مباحث کی بنیاد ہی اس بات پر قائم ہے کہ قضا و قدر کے عقیدے کو تسلیم کیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ انسانی قوتیں ایک ایسی ذات کے قبضہ قدرت میں ہیں جو کائنات کی تدبیر کرتی اور حوادث میں تصرفات پر قادر ہے کیونکہ اگر تاثیر و تاثر تمام و کمال انسانی طاقت ہی کے تابع ہوتا تو نہ کوئی بلند مرتبت انسان اپنے مرتبے

سے اُترتا نہ کبھی کسی کمزور کو قوت نصیب ہوتی اور نہ کبھی کسی کے شان و شکوہ کی عمارت منہدم ہوتی۔

قضا و قدر کا عقیدہ اگر عقیدۂ جبر کے بُرے اثرات سے ملوّث نہ ہو تو انسان میں جرأت و ہمت اور زندگی کی جدوجہد میں پیش قدمی دکھانے کا وصف اور شجاعت اور بہادری کے اخلاق پیدا کرتا ہے اور مہموں سے عہدہ برآ ہونے کی ہمت عطا کرتا ہے جہاں شیروں کا پتّا بھی پانی ہوتا ہے اس عقیدے سے ضبط و صبر کی قوتیں ابھرتی ہیں اور نفس میں آلام و مصائب کو برداشت کرنے اور ڈر اور خوف کا مقابلہ کرنے کا طبعی ملکہ پیدا ہوتا ہے یہ عقیدہ نفس کو جود و سخا کے زیور سے آراستہ کرتا ہے اور دنیاوی علائق اور مال و متاع سے بے نیاز ہونے کی ترغیب دلاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ انسان اپنی متاع زیست کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور وہ یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جس کی اُسے اس عقیدہ نے تعلیم دی ہے۔

جس شخص کا یقین کامل یہ ہو کہ موت کی ایک گھڑی معیّن ہے، اس کے رزق اور کفالت کی ذمّہ داری لی جا چکی ہے اشیائے عالم کا تصرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ ان کو اپنے ارادے اور مرضی کے مطابق تبدیل کرتا رہتا ہے، وہ دین حق کی حفاظت و مدافعت اور ملت کا بول بالا کرنے کے لئے موت سے کب ڈرے گا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جو فرائض

عائد کئے ہیں ان کی تعمیل میں سستی اور کم ہمتی کیوں کر دکھائے گا۔ صداقت کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے اور اپنے کردار کی شاندار عمارت کو احکام خداوندی اور اجتماع انسانی کے اصول کے مطابق بلندی پہ پہنچانے کے لئے اپنے مال و دولت کو خرچ کرنے میں وہ فقر و احتیاج کے خوف میں کیسے مبتلا ہوگا؟

اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کی فضیلت مندرجہ ذیل آیت میں بیان فرمائی ہے۔ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْھُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ۔ (وہ لوگ جن سے (منافق) لوگوں نے کہا کہ (کافر) لوگوں نے تمہارے (مقابلہ کے) لئے (بہت کچھ) جمع کر رکھا ہے اس لئے اُن سے ڈرو مگر اس (بات) سے ان کا ایمان (اور) بڑھ گیا اور کہنے لگے کہ خدا ہمارے لئے بس ہے اور اچھا ساتھی۔ تو وہ خدا کی ایک بہت بڑی نعمت اور مہربانی لے کر لوٹے۔ ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی پر چلنے لگے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑی مہربانی والے ہیں)۔

مسلمان اپنی نشاۃ وارتقاء کے ابتدائی دور میں اپنے پہلے مرکز سے اُٹھ کر مختلف ممالک کی طرف روانہ ہوئے اور ان پر فتح پاتے اور قبضہ کرتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑی بڑی حکومتوں کو زیر و زبر کر ڈالا اور بڑی بڑی قوموں کو مغلوب کر کے اپنا محکوم بنا لیا۔ یہ کام انہوں نے اس تیزی اور خوبی سے کیا کہ

عقلیں دنگ رہ گئیں۔ بیرنی کے پہاڑوں سے لے کر جو ہسپانیہ اور فرانس کے حد فاصل پر واقع ہیں دیوار چین تک ان کا تسلط قائم ہو گیا اگرچہ وہ تعداد میں تھوڑے تھے ان کے پاس سازوسامان کی کثرت نہ تھی اور مختلف آب وہواؤں میں زندگی بسر کرنے اور مختلف ممالک کے حالات سے موافقت پیدا کرنے کے عادی نہ تھے، اس کے باوجود انہوں نے بہت سے جلیل القدر بادشاہوں کی نیندیں حرام کر دیں اور اپنے وقت کے کئی قیصروں اور کسراؤں کو تخت سے اُتار دیا اور یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ اسی سال کی قلیل ترین مدت میں ہوا۔ یقیناً یہ ایک عظیم الشان معجزہ تھا! ان مجاہدوں نے بڑے بڑے شہروں کو زیروزبر کر ڈالا۔ عظیم الشان پہاڑوں کو عبور کیا۔ زمین کے اُوپر گرد و غبار کی ایک دوسری زمین پیدا کی۔ ان کے گھوڑوں کے سموں نے کئی سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں کو زمین میں ملا دیا اور اُن کے ہاتھوں نے ان پہاڑوں کے بدلے ان سرکشوں کی کھوپڑیوں سے نئے نئے پہاڑ اور ٹیلے کھڑے کئے جنہوں نے ان کی قوت وسلطنت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کے خوف سے ہر دل پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور ان کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی۔ شجاعت اور بہادری کے ان تمام مظاہر میں ان کی قیادت کرنے اور ان کی ہمتوں کو اُکسا کر آگے بڑھانے والا کون تھا؟ یہی قضا و قدر کا اعتقاد!

یہی قضا و قدر کا اعتقاد جس کے بل بوتے پر کبھی مسلمانوں کی ایک بہت

ہی قلیل تعداد ایسے ایسے بھاری لشکروں کے مقابلہ میں جم کر لڑی جن کی کثرت تعداد کا یہ عالم تھا کہ وہ فضا کی وسعتوں اور روئے زمین کی کشادگیوں سے بھی بڑے نظر آتے تھے اور نہ صرف جم کر لڑی بلکہ اکثر موقعوں پر ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے اور انہیں پشت دکھانے پر مجبور کر دیا۔

اسی اعتقاد کی وجہ سے ان کی تلواریں مشرق میں چمکیں اور ان کے عزم و ہمّت کی بجلیاں یورپ پر جا گریں۔ اور اہلِ یورپ لڑائی کے میدانوں میں حیران و پریشان دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ اسی اعتقاد نے ان کو اپنے کلمہ اور اصول کی بلندی کے لئے اپنے تمام اموال و املاک کو خرچ کرنے پر آمادہ کیا نہ انہیں فقیری کا خوف تھا اور نہ محتاجی کا ڈر۔ اسی اعتقاد کی بدولت انہیں اس بات میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اپنی اولاد، عورتوں اور زیر تربیت بچّوں کو لے کر ممالک عالم کے انتہائی سرحدات پر جنگ کے میدانوں کی طرف اس طرح روانہ ہو جائیں گویا وہ باغیچوں اور گلزاروں کی سیر کو جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا پر توکّل کر کے ان کو ہر حادثہ اور سازش کے خلاف امان مل گیا ہے یا ان کی جانوں کے گرد ایک فصیل کھڑی ہو گئی جو انہیں ہر حملہ اور مصیبت سے محفوظ رکھے گی۔ ان کی عورتوں اور بچّوں میں بھی ہمّت اور بہادری کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ عین میدانِ کارزار میں لشکروں کو پانی پلانے اور ان کی ضروریات کو مہیا کرنے کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ پختہ سن اور نوجوان مرد ول

اور عورتوں اور بچوں میں اگر کوئی فرق تھا تو یہ کہ مرد ہتھیار اُٹھانے کا کام سرانجام دیتے تھے۔ اور عورتیں اور بچے دوسرے فرائض میں حصّہ لیتے تھے۔ خوف نہ عورتوں کے پاس پھٹکتا تھا نہ بچوں کے۔ اسی اعتقاد نے ان کو اس درجہ پر پہنچایا کہ ان کے نام زبان پر لانے سے بڑے بڑے سورماؤں کا پتّا پانی ہو جاتا تھا۔ مخالفین کے خلاف ان کا رعب ہی بڑے امدادی لشکر کا کام دیتا تھا۔ ان کی تلواروں کی چمک اور نیزوں کی بجلیاں دیکھنے سے پہلے ہی مخالفین کے عظیم الشان لشکر گھبرا کر بھاگ جاتے تھے۔ بلکہ اپنی سرحدوں پر اسلامی لشکر کی ابتدائی ٹکریوں کے قدم پڑنے سے قبل ہی ان کی فوج میں بھگدڑ مچ جاتی تھی۔

ہائے ان گزرے ہوؤں کی یاد میں مجھے رونا آتا ہے ان پیش روؤں کا تصور کر کے میری آہیں نکلتی ہیں۔

اے رحمت کا ساتھ دینے والو! اور شفقت کی مدد کرنے والو! تم کہاں ہو۔ اے مروّت کے پہاڑو! اور طاقت کی چٹانو! تم کہاں ہو؟ کمک دینے کے لئے ہر وقت تیار رہنے والو! اور سختی کے وقت مظلوم کی فریاد سننے والو تم کہاں ہو؟ اے اس بہترین جماعت کے اراکین جسے خداوند تعالےٰ نے نیکیوں کو پھیلانے اور برائیوں سے روکنے کے لئے پیدا کیا تھا! کہاں ہو؟ اے شرف و قوّت رکھنے والو! عدل کی میزان ہاتھ میں لینے والو! انصاف کے ساتھ فیصلے کرنے والو! حکمت اور عقل کی باتیں سکھلانے والو!

ملت اور قوم کی بنیاد رکھنے والو! تم کہاں ہو؟ کیا تم اپنی قبروں میں سے اپنے اخلاف کے ان اعمال کو نہیں دیکھتے جو انہوں نے تمہارے بعد کئے اور ان بیماریوں کو محسوس نہیں کرتے جن میں تمہاری اولاد اور تمہاری شریعت سے منسوب ہونے والے آج کل مبتلا ہیں؟ ان لوگوں نے تمہاری سنّت کو چھوڑ دیا۔ تمہارے بنائے ہوئے راستوں سے بھٹک گئے۔ اس وقت وہ متعدد فرقوں اور ٹکڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ اور اس افتراق و پراگندگی کی بدولت کمزوری کے اس درجے کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ آج یہ لوگ اجنبی طاقتوں کے شکار ہیں نہ اپنے ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں نہ اپنی چہار دیواری سے آپس کی مخاصمت کو نکال کر باہر کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تمہارے عالم برزخ میں کوئی منادی ایسا نہیں جو وہیں سے ایک زوردار آواز دے کر بے خبروں کو خبردار اور سوتوں کو بیدار کر دے اور گمراہوں کو سیدھی شاہراہ پر ڈال دے۔ اِنّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون

میں کہتا ہوں اور پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اجتماعِ بشری کی تاریخ کا جب سے آغاز ہوا ہے اس وقت سے آج تک جتنے ایسے بڑے بڑے فاتح اور نامور گزرے ہیں جو اوسط طبقوں میں پیدا ہو کر محض اپنی ہمّت اور جدوجہد کے بل بوتے پہ درجات عالیہ تک پہنچے۔ جنہوں نے دشوار گزار گھاٹیوں کو آسانی سے طے کر کے بڑے بڑے سرکشوں کو اپنا تابع فرمان بنایا۔ جن کی حدود سلطنت حیرت انگیز حد تک وسیع ہو چکی تھیں اور جن کی شان و شوکت کے

قصے اب بھی اصحاب فکر کو تلاش عمل کی دعوت دیتے ہیں، وہ سب کے سب قضا و قدر کے معتقد تھے۔ سبحان اللہ! یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہو چکی ہے کہ وہ زندگی اور اس کے علائق کے بارے میں بے حد حریص اور بخیل واقع ہوا ہے پھر اس میں خطرات میں گھس جانے، ہلاکت کی پروا نہ کرتے ہوئے کڑی سے کڑی مہم میں کود پڑنے اور دست و گریبان ہو جانے کی ہمت اور جرأت کہاں سے آتی ہے؟ قضا و قدر کے اعتقاد سے! اور اس اطمینان سے کہ تقدیر کے سامنے ظاہری حوادث کے ڈر اور خوف کی کوئی حیثیت نہیں جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے، وہی ہو کر رہے گا!

تاریخ کے اوراق بتا رہے ہیں کہ کورش ایرانی (کیخسرو) جو قدما کی تاریخ میں سب سے پہلا فاتح ہے اور جس کے حالات مشہور ہیں صرف اسی لئے کامیابی سے ہمکنار ہوا کہ وہ عملاً قضا و قدر کا معتقد تھا۔ اسی عقیدے کی وجہ سے کسی سخت سے سخت مہم میں بھی اُس پر نہ کبھی کوئی گھبراہٹ مسلط ہوتی تھی اور نہ اس کے پختہ عزائم میں کمزوری آتی تھی۔ یونان کا سکندرِ اعظم بھی ان لوگوں میں تھا جن کے نفوس میں قضا و قدر کا عظیم الشان عقیدہ جاگزین تھا۔ مشہور فاتح چنگیز خاں تاتاری بھی اسی اعتقاد کے ماننے والوں میں تھا۔ اسی عقیدہ کی بدولت وہ جب چاہتا اپنا مٹھی بھر لشکر لے کر لاتعداد افواج سے آراستہ ملکوں پر حملہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ کامیابی اس کی منتظر رہتی تھی اور جہاں وہ جاتا تھا فتح و نصرت

کی محبوب دیوی اس کے قدم چومتی تھی۔ عقیدۂ قضا و قدر بڑا ہی اچھا عقیدہ ہے جو دلوں کو بزدلی کی رذیل ترین خصلت سے پاک کرتا ہے اور بزدلی ہی وہ اولین خصلت ہے جو انسان کو اس کے کمال تک پہنچنے میں حارج ہوتی ہے جس کو یہ روگ لگ جاتا ہے وہ چاہے کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو کمال تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ بعض مسلمانوں میں سے بعض عوام نے اس عقیدے کے ساتھ عقیدۂ جبر کے اجزا ملا لئے ہیں یا یہ اجزا خود بخود ان کے عقیدے میں شامل ہو گئے ہیں اور آخری ادوار میں مصائب کے جو واقعات ان پر گزرتے ہیں بہت ممکن ہے کہ ان کا سبب بھی یہی غلط اعتقاد (جبر) ہو، مگر ہوشمند اور پختہ کار علماء سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ اس شریف اور مبارک عقیدہ کو بعد کی لاحق شدہ بدعات کے عوارض سے مبرا کرنے کے لئے جد و جہد کریں گے اور عوام کو سلفِ صالح کے طریقے اور اعمال یاد دلائیں گے۔ اور امام غزالی اور ان جیسے دیگر ائمہ دین کے خیالات سے روشناس کرائیں گے اور انہیں بتلائیں گے کہ شریعت کی طرف سے توکل اور قضا پر اعتقاد رکھنے کا مطالبہ عمل اور جد و جہد کے لئے ہے۔ بیکاری اور سستی کے لئے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ اس پر توکل کرنے کی حجت پکڑ کر ہم اپنے فرائض کو چھوڑ دیں اور ہم پر جو واجبات مقرر کئے گئے ہیں۔ ان کی بجا آوری میں کوتاہی کریں۔ توکل کی حجت کو اس طرح اپنی بے عملی کا بہانہ بنا لینا بے دینوں اور زندیقوں

اور ان لوگوں کا کام ہے جو صراطِ مستقیم سے دور جا پڑے ہیں کسی مسلمان کو اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ ان اوقات میں ملت کی طرف سے مدافعت کرنا ہر مکلف مسلمان کا فرض بن گیا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے سچے اعتقادات کی طرف متوجہ کرنا جو ان کے اختلافات کو مٹا کر ان کے عزائم کو دوبارہ بلند کر دیں۔ اور کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے کے لئے ان کی غیرت کو جوش میں لائیں اس اس وقت کا سب سے بڑا کام ہے اور یہ کام علما کی تبلیغ اور دعوتِ خیر سے ہی سرانجام پا سکتا ہے۔

باقی رہا مسلمانوں کا انحطاط اور پس ماندگی۔ سو اس کا سرچشمہ نہ یہ قضا و قدر کا عقیدہ ہے اور نہ کوئی دوسرا اسلامی عقیدہ۔ اس انحطاط کو عقیدۂ قضا و قدر کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک نقیض کو دوسری کی طرف منسوب کرنا۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں جو فتوحات حاصل کی تھیں ان کی وجہ سے ان پر ایک قسم کا نشہ طاری ہو گیا اور انہیں شوکت و غلبہ کا خمار چڑھ گیا اور اسی خمار کی حالت میں ان پہ دو عظیم الشان مصیبتیں آئیں پہلی مصیبت مشرق سے اٹھی یعنی چنگیز خاں تاتاری اور ان کی اولاد نے حملہ کیا۔ اور دوسری مصیبت مغرب کی طرف سے نازل ہوئی یعنی ممالک اسلامیہ پہ یورپین اقوام نے ایک اجتماعی یورش کی۔ نشّے کی حالت میں آنے والے مصائب رائے اور فیصلے کی قوتیں سلب کر لیتے ہیں اور انسان پر دہشت اور غفلت طاری کر دیتے

ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد پے در پے کئی حکومتوں نے ان پر تسلط حاصل کر لیا اور ان کے سیاسی امور کے کرتا دھرتا وہ افراد بن گئے جنہیں اسلامی سیاست سے صحیح واقفیت نہ تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے اخلاق اور رجحانات کو بگاڑنے والے جراثیم میں یہ حکام اور نواب بھی شامل ہیں انہی نے مسلمانوں کی بدبختی اشقاوت اور مصیبتوں میں اضافہ کیا اور ان کے نفوس میں ضعف اور کمزوری کو جاگزین کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اکثر مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کی نظر صرف ان جزئیات پر پڑتی ہیں جن کا فائدہ ان کی ذاتی لذت اور عیش و عشرت کے حصول تک محدود ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ہی بھائی کا گلا پکڑا ہوا ہے اور کسی وجہ اور قومی سبب کے بغیر اسے ضرر پہنچانے میں مصروف ہے اور اب یہی ان کی زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔ دراں حالیکہ اسی چیز نے انہیں کمزوری اور نا امیدی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اور یہی ان کو اس بدترین درجے تک پہنچانے کی ذمہ دار ہے جس میں وہ آج نظر آتے ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں اور بالکل سچ کہتا ہوں کہ جب تک اسلام کے سچے اصول ان کے دلوں میں صحیح معنوں میں جاگزین ہیں جب تک اسلامی عقائد کے نقش و نگار ان کے ذہن کی لوح پر چمک رہے ہیں اور جب تک علمائے کاملین کے مابین ان عقائد کے درس و تکرار کا سلسلہ جاری ہے اس وقت تک ملت اسلامیہ کی موت ناممکن ہے۔ جو جو نفسانی بیماریاں اور ذہنی فتورات ان کو لاحق ہو چکے ہیں

وہ سب عقائدِ حقّہ کی طاقت سے ختم ہو جائیں گے اسلام کی ارتقائی رفتار اس کے اوّلین دور کی طرح پھر سے شروع ہو جائے گی۔ اپنے اوطان کو اجنبی طاقتوں کے دستبرد سے محفوظ کرنے کے لئے وہ از سرِ نو دانش و بصیرت کے مسلک اختیار کریں گے جو اقوام ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں ان کو دُور ہی سے ڈرا کر اپنی جگہ ٹھہر جانے پر مجبور کر دیں گے۔ یہ بات خدا کی حکمت سے کوئی بعید نہیں اور بہت سے تاریخی واقعات اس کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ خود عثمانیوں کو دیکھو کہ تاتاری اور صلیبی لڑائیوں کے بعد پھر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور روئے زمین پر ہر طرف اپنے لشکر پہنچا دیئے۔ ان کی فتوحات کے میدان وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ وہ کئی ملکوں کو زیر و زبر کر گئے۔ اور کئی بادشاہوں نے ان کے سامنے سپر ڈال دیئے۔ یورپین حکومتیں ان کی شوکت کا لوہا ماننے لگیں یہاں تک کہ ان سلطنتوں میں عثمانی سلطان "سلطان اکبر" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

ذرا اپنی نظر دوبارہ دوڑاؤ، تمہیں ان میں ایک نیا جوش اور ترقی کی نئی اُمنگ نظر آئے گی۔ تازہ حوادث نے عاقبت کی خرابی کے متعلق جو خطرے ان کے دلوں میں پیدا کر دیئے ہیں، وہی ان کے اس نئے جوش اور امنگ کو بروئے کار لانے کا سبب ہیں۔ یہ امنگ اکثر مشرقی و مغربی ممالک کے صاحب بصیرت مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہے اور انہوں نے حق کی حمایت کے لئے ایسی جماعتیں

قائم کرلی ہیں جنہوں نے انصاف اور شریعت کی امداد کرنا اور اپنے افکار کی تبلیغ واشاعت کرنا اور اختلافات کو مٹا کر مسلمانوں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا اپنا نصب العین قرار دیا ہے ان کی عملی جدوجہد کا ایک ادنیٰ نمونہ اس عربی جریدہ کا اجرا ہے جو اپنے بیش بہا مضامین کے ذریعے دُور دراز علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان روابط پیدا کرے گا اور ان کو اجنبی طاقتوں کی سازش سے باخبر رکھے گا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس نیک جماعت کے اراکین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے اعمال کو بارآور کرے ۔ اور اس کے سچے مقاصد کی تائید فرمائے ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اُمید ہے کہ اس جماعت کے مساعیٔ حسنہ سے مشرقیوں کے حق میں خصوصاً مفید نتائج مرتّب ہوں گے ۔

سیاست

اسلام اور وطنیت

قوموں کے حالات کا تجسس کرو گے اور ان کے افراد کے قلبی میلانات کو ٹٹولو گے تو ان میں نسلی تعصب کی جھلک نمایاں نظر آئے گی۔ اور نسلی تعصب رکھنے والے افراد اپنی قوم کے مفاخر کا ڈھنڈورہ پیٹتے اور ان کے معائب ظاہر ہونے پر غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس اضطراری خوشی اور غضب کی وجہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ نسلی تعصب کو فطری جذبات میں شمار کرنے لگے ہیں حالانکہ غور کرو تو فطرت میں مسئلہ تعصب کو کوئی دخل نہیں۔ فرض کرو کہ اگر کوئی بچہ ایک قوم میں پیدا ہو اور سن شعور کو پہنچنے سے پہلے کسی دوسری قوم میں لے جا کر اس کی تربیت کی جائے اور اس کو اپنے اصلی وطن کا کوئی پتہ نہ دیا جائے تو ہمیں اس کی طبیعت میں اپنے ہم مولدوں کی طرف کوئی میلان نظر نہیں آئے گا۔ اور اس کے لئے سارے وطن برابر ہونگے۔ بلکہ وہ وطن جہاں اس کی نشو و نما اور تربیت ہوئی ہے اور اس وطن کے رہنے والے اسے زیادہ محبوب ہوں گے۔

اس لئے ہم یہ تو نہیں کہتے کہ یہ کوئی فطری جذبہ ہے۔ ہاں ضرورتوں اور مجبوریوں نے نفوس کی خالی تختیوں پر منافرت کے نقوش ثبت کر کے اس تعصب

کو فطری جذبات کا درجہ دیا ہے۔ انسان روئے زمین کے کسی حصّہ میں بھی رہے اسے اَن گنت ضروریات پیش آتی ہیں اور جب تک کسی شخص کی صحت مند تربیت نہ ہوئی ہو وہ انسانی منافع کو اپنی ذات سے مخصوص کرنا اور دوسروں پر اپنے آپ کو ترجیح دینا پسند کرتا ہے۔ لالچ کی کثرت کے ساتھ جب اقتدار بھی مل جاتا ہے تو اس کا نتیجہ لازمی طور پر ظلم و زیادتی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے جمعیت انسانی کے بعض افراد دوسروں کے مظالم کا شکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ مدتوں تک ان مظالم میں مبتلا رہنے کے بعد افراد انسانی نے مجبوراً نسبتی رشتہ کے اعتبار سے اپنی تنظیم کی چھوٹے خاندانوں سے یہ سلسلہ بڑے خاندانوں تک پھیلتا گیا یہاں تک کہ نسل انسانی ہندی، انگریزی۔ روسی۔ اور ترکی وغیرہ مختلف قوموں میں بٹ گئی۔ اور ہر قوم کو اپنے ہم خیال افراد کی قوت کے بل بوتے پر دوسری قوموں سے اپنے منافع کو محفوظ رکھنے اور اپنے حقوق کا بچاؤ کرنے پر قدرت حاصل ہوئی انسان کی عادت ہے کہ وہ کسی معاملے میں بھی اعتدال پر قائم نہیں رہتا۔ اس اتحاد و اتفاق کے معاملہ میں بھی وہ حد سے بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ ہر قوم اپنی انفرادیت پر شدت سے کاربند ہوگئی اور دوسری قوموں کے تسلط سے یکسر بچنے بچانے لگی کیونکہ اوّل تو دوسروں کے متعلق یہ یقین ہوتا کہ وہ اپنے عہد حکومت میں ظلم و تعدی سے باز نہیں رہیں گے۔ اور عدل و انصاف سے پیش نہیں آئیں گی لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے تب بھی غیروں کی محکومیت میں نفس کو ذلت اور کہتری کا شدید احساس ہوتا ہے۔

اس قسم کا تعصب جس طرح بعض ضرورتوں کے تحت وجود میں آتا ہے اسی طرح ان ضرورتوں کے ختم ہونے پر معدوم بھی ہو سکتا ہے اور یہ ضرورتیں اس وقت تک ختم ہو ہی جاتی ہیں جب انسان ایک ایسے حاکم پر اعتماد کرے جس کے سامنے دنیا جہاں کی تمام قوتیں ہیچ نظر آئیں جسکی عظمت کے سامنے بڑے سے بڑے انسانی اقتدار کا چراغ مدھم پڑ جائے اور اُس کی قدرت کے آگے نفوسِ انسانی اپنے عجز کو تسلیم کریں یعنی وہ ذاتِ عظیم جو سماوات پر غالب اور ساری کائنات کا مبداء ہے اور جس کی طرف سے اس کے احکام کو نافذ کرنے کا کام ایسی ہستی نے ہاتھ میں لیا جو عام لوگوں کے ساتھ احکم الحاکمین کے احکام کی بجا آوری، اور بندگی میں برابر کا حصہ دار ہو جس وقت نفوس کو حاکم اعلیٰ کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ جس ذات نے اس کے احکام کو پھیلانے کا بیڑا اٹھایا ہے وہ خود بھی ان احکام کی پابندی میں ان کے ساتھ شریک ہے تو وہ حقوق کی حفاظت اور ضرر کی مدافعت میں اس پر عظمت و جبروت ہستی کے احکام پر کلّی اعتماد کر لیتے ہیں۔ اور ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے نسلی عصبیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے والحکم للہ العلی الکبیر۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مختلف ممالک میں اقامت گزین ہونے کے باوجود نسلی تعصب سے بے نیاز ہیں اور اسلامی تنظیم اور جماعت بندی کے سوا ہر قسم کے اتحاد و اتفاق کو خیر باد کہہ چکے ہیں کیونکہ دین اسلام کا معتقد جب اپنے اعتقاد میں پختگی حاصل کر لیتا ہے

تو جنس اور قبیلہ کے امتیازات کو بھول جاتا ہے اور ان محدود رشتوں کے بجائے عقیدہ کے وسیع اور ہمہ گیر رشتے پر اعتماد کرتا ہے۔

دین اسلامی کی تعلیمات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف مخلوق کو حق کی دعوت دینے اور ان کی روحانی قوتوں کو عالم ادنےٰ سے عالم اعلیٰ کی طرف متوجہ کرنے تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ افراد انسانی کے باہمی تعلقات کی حد بندی اور ہر قسم کے کلّی اور جزئی حقوق کی مکمل وضاحت بھی پیش کرتی ہیں اسلام نے قوانین اور حدود جاری کرنے والی ہیئت حاکمہ پر بھی کڑی پابندیاں لگائی ہیں اور اس کے لئے ایسی شرطیں مقرر کی ہیں کہ اس ادارہ کی باگ ڈور صرف وہی شخص سنبھال سکتا ہے جو خود قانونِ شریعت کی پابندی کرنے میں سب سے زیادہ اہتمام دکھلا سکے۔ یہ منصب کسی کو نہ تو وراثت سے مل سکتا ہے نہ نسلی یا قبائلی امتیاز سے، نہ جسمانی طاقت سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ مال و طاقت کے زور سے، بلکہ اس پر فائز ہونے کے لئے احکام شریعت کی پوری واقفیت، اُن کو نافذ کرنے کی طاقت اور قوم کی تائید اور اعتماد کرنا حاصل کرنا ضروری ہے۔ بہ الفاظ دیگر مسلمانوں کی حکومت درحقیقت شریعتِ مقدسہ اور قوم کے اتفاق رائے کے ہاتھ میں ہے۔ شریعت کی نظر میں گورے کو کالے پر، یا ایک نسل کو دوسری پر فوقیت حاصل نہیں جو مسلمان اپنی قوم کا سردار یا امیر بنتا ہے اسے قوم کے باقی افراد پر صرف اس معنی میں امتیاز حاصل

ہے کہ وہ شریعت کی حفاظت اور دشمنان دین کی مدافعت میں سارے مسلمانوں سے پیش پیش ہے۔

حقوق کی حفاظت ہو یا جان و مال اور عزّت و آبرو کے بچاؤ کا سوال ان میں شارع کے نزدیک حسب و نسب کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے اور عہدے یا منصب کی وجہ سے پیدا ہونے والے امتیاز کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے برعکس شریعت مقدسہ کے سوا دوسرے ہر قسم کے رابطہ کو شارع نے قابل تعزیر ٹھہرایا ہے۔ متعدد آیات اور احادیث میں غیر شرعی اجتماع پر اعتماد کرنے اور غیر شرعی تعصب رکھنے والوں کی مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے :۔

لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَۃٍ وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلٰی عَصَبِیَۃٍ وَ لَیْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلٰی عَصَبِیَۃٍ ۝ (عصبیت کی طرف بلانے والا ۔ عصبیت کی بنا پر لڑنے والا اور عصبیت کی حمایت پر مرنے والا ہم مسلموں میں شمار نہیں۔)

شارع کی نظر میں صرف اسی شخص کی عزت و احترام کو امتیاز حاصل ہوگا جو تقویٰ اور اتباع شریعت میں سب پر فوقیت رکھتا ہو۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ (خدا کے نزدیک تم سب میں زیادہ قابل عزت وہ ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑھا ہوا ہو)۔

چنانچہ مختلف اداروں اور مختلف قبائل میں مسلمانوں کی زمام حکومت

بسا اوقات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی جنہیں نہ صرف نسلی شرف حاصل تھا کوئی اور نہ وہ اپنے قبیلہ کے ممتاز لوگوں میں تھے اور نہ انہیں باپ دادا کی طرف سے حکومت وراثت میں ملی تھی اور نہ اپنے نسب یا منصب کی بنا پر انہوں نے حکومت کا مطالبہ کیا تھا۔ صرف شریعت کی اطاعت اور دین کی حمایت کے جذبے نے انہیں مسندِ حکومت پر بیٹھنے کا موقعہ دیا۔

مسلمان حاکم جب تک شخصی اقتدار کی ہوس سے الگ تھلگ رہے اور احکامِ الٰہی کے تابع فرمان رہے اس وقت تک ان کا اثر و نفوذ بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ اور جب بھی ان میں سے کسی نے جاہ و جلال کے حصول میں عام مسلمانوں پر تفوق حاصل کرنے اور اپنی رعایا کی بہ نسبت وسائل آرام سے زیادہ متمتع ہونے کی کوشش کی ہے، افراد نسلی تعصب کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اختلاف بڑھ گیا ہے اور اس حاکم کا تسلط محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

جس دن اسلام کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ قبائلی اور رنگ و نسل کی بنیاد پر قائم ہونے والے اتحاد و اجتماع کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک صرف مذہبی اخوت ہی قابل اعتنا ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ عرب ترکی حاکموں کے تسلط کو بالکل بُرا نہیں سمجھتے۔ ایرانی ایک عرب مسلمان کی سیادت کو قبول کر لیتا ہے اور ہندی مسلمان ایک افغانی مسلمان کی ریاست

کا تابع فرمان رہ سکتا ہے۔ کسی کے دل میں اس غیر نسلی حکومت کے خلاف جذبۂ عداوت نہیں ابھرتا اور کوئی اس محکومی میں کسرِ شان محسوس نہیں کرتا جب تک مسلمان حاکم خواہ وہ کسی نسل کا ہو، شریعت کی شاہراہ پر چلتا اور اس کے شعائر کا احترام کرتا ہے مسلمان اس کی اطاعت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حکومتوں کی تبدیلی مختلف شکلوں میں اس کے ڈھانچے کا ردو بدل ایک سے دوسری جماعت کی طرف ان کا منتقل ہونا۔ یہ تمام انقلابات انہیں کبھی متاثر نہیں کرتے۔ ہاں جب حاکم شریعت سے بے راہ روی اختیار کرے اور اپنے نفس کو جائز حقوق سے زیادہ اہمیت دے تو اس کی طرف سے دل پھر جاتے ہیں۔ اور اپنی رعایا کا ہم وطن ہونے کے باوجود اس کی حالت اجنبیوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

دنیا میں مذاہب کے جتنے پیرو ہیں۔ ان میں مسلمانوں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جب وہ کسی اسلامی خطہ کے بارے میں سُن لیتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں نے کسی خاص اسلامی حکم کو ترک کر دیا تو خواہ ان کی نسل اور جنس کچھ بھی ہو، وہ اظہارِ افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کسی اسلامی ملک کے چھوٹے سے چھوٹے حاکم کو لے لیجئے۔ اگر وہ احکامِ خداوندی کا پیرو ہو اپنے ملک کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتا۔ عام اہلِ سلطنت کو حدودِ شرع کی پابندی پر مجبور کرتا۔ اپنی رعایا کے دوش بدوش مساویانہ طور پر حدود الٰہی کے سامنے سر انداز ہوتا اور تعیشات سے کنارہ کش رہتا تو اس ملک کا پھیلانا اور

تسلط کا بڑھانا اس کے لئے نہایت آسان تھا اور اس طرح مال کو دولت کو خرچ کرنے لشکروں کو بڑھانے، بڑی بڑی سلطنتوں کا مقابلہ کرنے یا "تمدن کے مددگاروں" اور "آزادی کے دردمندوں" کی مداخلت کے بغیر اس کی عظمت کا غلغلہ ان ممالک میں بلند ہو جاتا جو دین اسلام کے پیروکاروں سے آباد ہیں اس کے لئے قوت کے مادی ذرائع یعنی مال و دولت، قدم و حشم اور فوج و لشکر کے بجائے صرف صحیح اسلامی طریقہ کار اور خلفائے راشدین کے جادہ مستقیم پر گامزن ہونا ہی کافی تھا۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہو جاتا کہ دین کی تعلیم کا رخ صرف عقبیٰ کی طرف نہیں ہے بلکہ اس نے بندوں کو ایسے احکام کی تلقین بھی کی ہے جن میں ان کی دنیوی ترقی مضمر ہیں۔ جو ان کو عالم آخرت کی سعادت کے ساتھ ہے اور اس دنیا کی نعمتوں سے بھی ہمکنار کرتی ہے تو جو شخص دین کی پیروی کرتا ہے اُسے آخرت کی سعادت کے ساتھ ساتھ دنیوی فلاح خود بخود حاصل ہو جاتی ہے اور اسی کو شریعت کی اصطلاح میں سعادت دارین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زمانے کی ہوا تغیر پذیر ہو چکی اور آسمان کا رنگ یہاں تک بدل گیا کہ کہیں کہیں مسلمانوں نے حکام کی ظلم پروری اور بے راہ روی سے تنگ آ کر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ اور تنگدل ہو کر اجنبی تسلط کو پسند کرنے پر راضی ہو گئے مگر جونہی انہوں نے اجنبی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا وہ

فوراً ندامت محسوس کرنے لگے۔ ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو اپنے آپ کو قتل کرنا چاہتا ہو۔ مگر جب اس کو درد محسوس ہونے لگے تو ارادہ ترک کر دے اور "انا للہ" پڑھنے لگے۔

اس وقت ممالک اسلامیہ میں جو تشتت و افتراق پھیلا ہوا ہے۔ اس کا سبب خود حاکموں کا قصور، ملّتِ اسلامیہ کے بنیادی مسائل سے اعراض، اور اپنے اسلاف کی کھلی شاہراہوں سے انحراف ہے کیونکہ صحیح اصول کا چھوڑنا اور دیکھے بھالے راستوں سے ہٹ کر چلنا ہی سلطنت کی کمزوری اور حاکم اعلیٰ کے زوالِ اقتدار کا موجب ہے۔ ہاں جب مسلمان حاکموں کا طبقہ شریعت کے قواعد پر دوبارہ گامزن ہوگا اور اوّلین سابقین کی سیرت کے مطابق چلنے لگے گا تو تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تعالیٰ ان کو سلطنت کی وسعت اور ائمہ دین، و خلفائے راشدین کی سی عزّت دوبارہ بخش دے گا۔ انشاءاللہ۔ وفّقنا اللہ للسداد وھدانا لطریق الرشاد (خداوند تعالیٰ ہمیں سیدھی راہ چلنے کی توفیق اور رشد و ایمان کے راستہ پر گامزن ہونے کی ہدایت عنایت فرمائے)

اجتماعیات کا اسلامی دستور

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ یُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں جو راہ حق اور صراط مستقیم کے نشانات کو بتا رہی ہیں کوئی گمراہ ہی ہوگا جو ان کی سچائی میں شک کرے گا۔ پھر کیا یہ ہو سکتا ہے جو وعدہ کرنے والوں میں سب سے سچا اور ڈرانے والوں میں سب سے زیادہ با اقتدار ہے اپنے وعدوں کو توڑ دے اور اپنی وعیدوں کا کوئی لحاظ نہ کرے۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو جھٹلا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے نبیوں کو رسوا کر سکتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو دھوکا دے کر گمراہی کے راستہ پر ڈالنا چاہا ہے؟ نعوذ باللہ!!

کیا اللہ تعالیٰ نے ان کھلی اور روشن آیتوں کو عبث نازل فرمایا ہے؟ کیا اس کے رسولوں نے اس پر جھوٹ اور افترا باندھ کر یہ پیغام سنا دیئے ہیں؟ پھر کیا خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رموز و اشارات سے خطاب کیا جن کا سمجھنا اور ان کا ادراک کرنا ان کی قدرت سے باہر ہو؟ کیا ان کو ایسی زبان سے دعوت دی گئی جو ان کے فہم میں نہیں آسکتی؟ نعوذ باللہ!

ایسا ہرگز نہیں۔ استغفر اللہ! اللہ تبارک و تعالیٰ قدسی صفات کے مالک ہیں اور ظالموں کے غلط اندازوں سے بہت بلند اور منزّہ ہیں۔ ان کا وعدہ سچا ہے اور ان کی وعید صادق۔ انھوں نے کسی جھوٹے کو اپنا رسول نہیں بنایا اور کوئی چیز بیکار پیدا یا بیان نہیں کی۔ ان کی ہدایت ہمیشہ رشد و صلاح کے راستے کی طرف ہوتی ہے اور ان کی آیات کبھی تبدیل نہیں کی جاسکتیں۔ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے مگر ان کی کتاب کے احکام میں سے ایک بھی ٹل نہ سکے گا۔ بلاشبہ وہ ایسی کتاب

ہے۔ جہاں باطل کو رخنہ اندازی کرنے کا کسی طرح موقعہ نہیں مل سکتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون" اور فرماتے ہیں۔ وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ" اور "وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی محکم آیتیں اور سچے وعدے ہیں جن میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ ان میں تاویل کی کوشش وہی شخص کریگا جو گمراہ ہو چکا ہو اور احکام خداوندی میں یہود و نصاریٰ کی طرح تحریف کرنا چاہتا ہو۔ اس امّت مرحومہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ جس کو اللہ تعالیٰ کبھی نہیں توڑیں گے کہ ان کی مدد کی جائے گی اور ان کو شوکت اور کامرانی عطا کی جائے گی انہیں ان موعودہ مقامات تک پہنچنے کے راستے بتلائے اور ہموار کئے گئے ہیں۔ ان کی بزرگی اور عزت کے وعدہ کے لئے کوئی حد مقرّر نہیں کی گئی۔ تا روزِ قیامت یہ وعدہ قائم رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس امّت کو اللہ تعالیٰ نے بے سرو سامان سے صاحب سامان بنایا اور بلندی کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچایا پھر بلند بلند پہاڑوں پر ان کے قدم جم گئے اور محکم اور مہیب چٹانیں ان کی عظمت کے سامنے متزلزل ہو گئیں جنگل کے شکاری شیروں کے پتّے ان کی ہیبت سے پانی ہو گئے اور سنگدلوں کے دل ان کے رعب سے پگھل گئے۔ ان کے غلبے نے ہر نفس کو ہیبت زدہ کر دیا اور

ہر صاحب عقل ان کے انقلابی کارناموں کے اسباب کو سمجھنے سے قاصر رہ گیا۔

مگر جن کے قلوب کو خداوند تعالیٰ نے حق کی روشنی سے منور کیا تھا۔ وہ سبب کو بھانپ گئے اور پکار اُٹھے کہ " ہاں یہ لوگ اللہ کا کام کر رہے ہیں اس لئے اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ اس جماعت نے اللہ کے دین کی حمایت کا علم بلند کیا اور اس کے قوانین سے رشد و ہدایت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی امداد کی۔" یہ امت اپنے آغاز میں نہ ذخائر کی مالک تھی اور نہ اس کے پاس کافی ہتھیار اور سامانِ جنگ موجود تھا مگر اس کے باوجود وہ قوموں کے صفوں کو چیر کر ان کے ممالک پر قابض ہوئی۔ نہ مجوس کے برج اور خندقیں اس کو واپس کر سکیں اور نہ رومن قلعے اور حصار اس کی پیش قدمیوں کو روک سکے۔ نہ راستوں کی مشکلات اس کے عزائم میں حائل ہو سکیں اور نہ اختلاف آب و ہوا اس کی ہمت کو پست کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ مخالفین کی دولت و ثروت بھی ان کے ارادوں پر کوئی اثر نہ ڈال سکی اور بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں کا جاہ و جلال بھی ان کو مرعوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کی گوناگوں مصنوعات، علوم و فنون کے دائرے کی وسعت، قوانین کا استحکام، منظم دستورہائے حکومت اور فنونِ سیاست کی وسعت غرض کوئی چیز بھی ان کی آنکھوں کو خیرہ، رفتار کو سست اور پائے ثبات کو متزلزل نہ کر سکی۔ جب یہ لوگ کسی سرزمین پر اوّل اوّل قدم رکھتے تو وہاں کے لوگ پہلے تو ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور ان کو ذلیل و خوار سمجھتے۔ کسی کے وہم و گمان

میں بھی یہ بات نہ آتی کہ ان کے چھوٹے سے چھوٹے گروہ اتنی بڑی سلطنت کو متزلزل کردیں گے اور مجد و بزرگی کے دیوان سے ان کا نام مٹا دیں گے۔ اتنی عظیم الشان قوموں پر غالب آجائیں گے اور ان کے دلوں میں اپنے مذہبی عقائد کو راسخ کرکے ان کو اپنے احکام، عادات اور قوانین کا تابع فرمان بنالیں گے مگر وہم وگمان میں نہ آنے کے باوجود یہ ساری باتیں پوری ہو کر رہیں اور خداوندی رحمتوں سے مالا مال یہ امّت مادّی لحاظ سے بے آسرا اور بے سہارا ہوتے ہوئے بھی کامیابی کے ان درجات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی جو غیروں کی دسترس سے باہر تھے بیشک وہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے خدا کے ساتھ جو وعدہ کیا اسے سچّا کر دکھایا اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو دنیا کی بزرگی اور آخرت کی سعادت کی شکل میں پورا پورا اجر عطا کردیا۔

یہی اُمّت آج شمار میں ۲۰ کروڑ کے قریب ہے اس کے ممالک و مساکن بحر اٹلانٹک سے لے کر چین تک پھیلے ہوئے ہیں جن کی زمینیں زرخیز اور جن کے کھیت سرسبز ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کے ممالک لوٹے اور مال چھینے جارہے ہیں۔ اس کے مختلف فرقوں اور قبیلوں کو اجنبی طاقتیں ایک ایک کرکے مغلوب کرتی رہتی ہیں۔ اور اُن کی مقبوضات کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے یکے بعد دیگرے ہڑپ کرتی جاتی ہیں۔ ان کی کوئی آواز نہیں جو سُنی جائے اور کوئی حکم نہیں جو مانا جائے۔ اس وقت ان کے جو بادشاہ باقی رہ گئے ہیں ان کی یہ حالت ہے کہ

صبح کو آنکھیں کھولتے ہیں تو ایک نیا حادثہ ان کے دروازوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ اور شام ہوتی ہے تو دوسری بلائے ناگہانی اپنے مصائب کا پشتارہ لئے پہنچ جاتی ہے۔ نئے نئے مصائب و حوادث کی یورش نے ان کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے اور ان کی امیدیں بڑھانے کی بجائے ان پر ایک خوف و ہراس مسلط کر دیا ہے۔

یہی وہ امت ہے کہ کل تک جس کے آگے دوسری عظیم الشان حکومتیں اپنے بقاء و تحفظ کی خاطر جزیہ ادا کرنے کے لئے خود بخود ہاتھ بڑھاتی تھیں اور آج اسی امت کے سلاطین اپنی بقا کے لئے انہی حکومتوں کا سایہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

کیا یہ عظیم الشان حادثہ نہیں۔ کیا یہ قہر الٰہی نہیں۔ آخر اس پستی اور انحطاط کا کیا سبب ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے بارے میں ہم نے بدگمانیاں شروع کر رکھی ہیں۔ خدا کی پناہ! کیا ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید رہیں گے اور یہ گمان کریں گے کہ جو کچھ اس نے ہمیں بتایا وہ جھوٹ تھا۔ نعوذ باللہ! کیا ہم اپنی مدد کے وعدہ اور بار بار کے موکد وعدے کے بعد بھی ہم اللہ تعالیٰ کے بیان میں شک کریں گے۔ خداوند تعالیٰ کی ذات پاک ہے، نہ ایسا کبھی ہوا اور نہ ہوگا۔ ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھنا چاہئے اور اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے۔ خامیاں ان ہی میں نکلیں گی اور ہمیں صرف انہی پر ملامت کرنے کا حق پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے قوموں کی رفتار کے لئے قوانین جاری کر رکھے ہیں جن کے بارے میں خود اس کا فرمان ہے۔ لن تجد لسنة اللّٰہ تبدیلا ؕ

اپنی محکم آیتوں کے ذریعے وہ یہ بھی ارشاد فرماتا ہے۔ کہ امتیں اور قومیں عزو احترام کے تخت سے اسی وقت اُتاری جاتی ہیں۔ اور لوحِ وجود سے ان کا نام اُسی وقت مٹایا جاتا ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قوانین کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ کسی قوم کی عزّت و سلطنت، رفاہیت تنعم، امن اور راحت کو اللہ تعالیٰ اُس وقت تک تبدیل نہیں کرتے جب تک وہ قوم خود اپنے حالات کو تبدیل نہیں کرتی۔ عقل کی روشنی، فکر کی صحت مندی بصیرت کی جلا امم سابقہ کے ساتھ خدا کی رحمت و غضب کا جو سلوک ہوا ہے اُس میں غور و خوض کرنا اور اس سے عبرت حاصل کرنا، یہ وہ اوصاف ہیں کہ جب تک کسی قوم میں موجود ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی مستحق رہتی ہے لیکن جب وہ انصاف کے طریقہ کو چھوڑ کر بینش و دانش کے راستہ سے نکل جاتی ہے اور رائے کی استقامت قول کی سچائی، دل کی صفائی، عفّت و عصمت، حق کی حمیت، اور صداقت کی تائید و حمایت کے لئے باہمی تعاون کے اوصاف سے یکسر عاری ہو جاتی ہے۔ انصاف کا راستہ چھوڑ دیتی ہے اور اعلاء کلمتہ الحق کے لئے ایک مرکز پر جمع نہیں ہوتی۔ باطل اغراض و خواہشات کے درپے ہو جاتی ہے بڑے بڑے منکرات کی مرتکب ہو کر اپنے عزائم کو کمزور کر لیتی ہے۔ انصاف پسند قوانین کی حفاظت کے لئے جان و مال قربان کرنے سے گریز کرتی ہے۔ اور باطل کے زیرِ سایہ زندگی کو حق کی امداد کرنے والی جماعت کے ساتھ مرجانے پر ترجیح دیتی

ہے۔ تب اللہ تعالیٰ اسے ذلت و رسوائی اور زوال و انحطاط کی سزائیں دے کر آنے والی قوموں کے لئے عبرت کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔

قانونِ الٰہی یہی ہے کہ جو قومیں مندرجۂ بالا اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہوتی ہیں وہ نشوونما پا کر بقائے دوام حاصل کر لیتی ہیں اور جو ان اوصاف کو پس پشت ڈال دیتی ہیں، وہ ہلاک اور برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا ابدی قانون ہے جو قوموں کے اختلاف سے بے نیاز ہے۔ جس میں وقت کی رفتار اور تبدیلی سے کوئی فرق نہیں آتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح تخلیق و ایجاد رزق رسانی اور موت و حیات کے قوانین متغیر نہیں ہوتے۔

ہمیں چاہیئے کہ اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ اپنے اخلاق کا جائزہ لیں اور اپنی رفتار کی شاہراہوں کو دیکھیں کہ کیا ہم ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں جو ایمان و یقین کے پتلے تھے؟ کیا ہم اسلافِ صالحین کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کر رہے ہیں۔ کیا اپنی جانوں پر خود تباہی لائے بغیر ہم تباہ ہو گئے کیا بلا سبب اللہ تعالیٰ نے ہماری حالت کو تبدیل کر کے اپنے حکم کے خلاف کیا اور اپنے قانون کو بدل دیا۔ کبھی نہیں اللہ کا قانون تغیر و تبدل سے مبرا ہے۔ اس کا وعدہ پورا ہو چکا تھا۔ مسلمان زمین کے مالک بن چکے تھے اور ہمارے اسلاف عزت و اقتدار کا محبوب منصب حاصل کر چکے تھے۔ مگر جب ہم نے سستی اختیار کی، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے لگے۔ آپس کے اختلافات میں اُلجھ گئے اور اپنی

کثرت تعداد کے دھوکے میں اگر تعیّشات میں پڑ گئے۔ تو ہماری کثرت ہمارے کسی کام نہ آئی اور ہماری عزّت کو ذلّت، بلندی کو انحطاط، دولت کو احتیاج اور سیادت کو غلامی میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو پسِ پشت ڈالا اور کلمۂ حق کی فتح و نصرت کے لئے ایک دوسرے کی امداد نہ کی۔ خداوند تعالیٰ نے بھی ہمیں اپنے اعمال کی پاداش میں خواری و تباہی کا مزہ چکھایا ہم دیکھ رہے ہیں کہ اجنبی ہمارے ممالک پر قبضہ کر رہے ہیں۔ ہمارے بھائیوں کو ذلیل کر رہے ہیں۔ اور بے گناہ مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنے آپ پر ملامت کرنی چاہئے اور نجات طلب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جس کا راستہ صرف یہی ہے کہ اپنے گزشتہ اعمال سے توبہ کر کے دوبارہ خلوصِ دل سے خداوند تعالیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔

ہم دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں اور ہر فرد اس تمنا میں محو ہے کہ اجل کی مہلت ہزار سال تک بڑھا دی جائے خواہ اس ہزار سالہ زندگی میں اسے ذلّت کی غذا فاقہ اور احتیاج کا لباس اور خواری و بے عزتی کا مکان ہی کیوں نہ دیا جائے۔ ہماری قومی آواز مشرق و مغرب میں متفرّق ہو گئی ہے اور ہمارے باہمی وسائل و روابط ٹوٹنے لگے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے ہمدردی نہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی کے مصائب سے سروکار نہیں۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ رشتۂ اخوت کا لحاظ نہیں رکھتا۔ کہیں شعارِ دین کا احترام اور دائرہ مذہب کی حمایت دیکھنے میں

نہیں آتی۔ اللہ کا حکم ہے کہ اپنے جان و مال کی قربانی سے اپنے مذہب کی حفاظت کرو لیکن ہم اس حکم کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ افرادِ ملت کی اس بے انتہا تعداد اور سوادِ اعظم کو دیکھئے اور پھر اس بات کو دیکھئے کہ اپنے ممالک اور اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے وہ اپنے خزانہ سے ایک کوڑی تک خرچ نہیں کرتے۔

کیا مومنوں کا لباس پہن کر دنیا کے سامنے پیش ہونے والے اس فریب میں مبتلا ہیں کہ ان کی زبانوں کے ظاہری کلمات سے جن کا اثر ان کے قلب پر کچھ بھی نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائیں گے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بھی بچتے رہیں۔ مال و دولت کے منافع پر بھی مطمئن رہیں اور امتحان و آزمائش کے وقت میدان سے پیچھے بھی ہٹتے جائیں۔ اور پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں گے؟ کیا وہ اس خیال میں ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے مخفی عزائم کا امتحان لے کر ان کے دلوں کے اسرار کو نہیں کھولیں گے؟ کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو اس گومگو کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے اور برے اور بھلے کا امتیاز اسی دنیا میں کر کے رہیں گے؟ کیا وہ یہ بھول گئے کہ اللہ تعالےٰ نے مومنوں کے جان و مال کو خرید کر دینِ الٰہی کی امداد اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کا کام ان کے سپرد کر دیا ہے۔ اس کے راستے میں نہ انہیں مال پر ہاتھ رکھنے کا اختیار ہے۔ اور نہ جانوں کو عزیز رکھنے کی اجازت؟ پھر کیا اس کے بعد وہ مومن اپنے آپ کو مومن کہہ سکتا ہے جس نے ایمان کی راہ میں نہ مالی ذرائع

سے کوئی قدم اٹھایا ہو اور نہ کسی قسم کی جانی امداد دی ہو۔

بندۂ مومن کہلانے کا مستحق وہی ہے جو ہمیشہ ایک اللہ سے ڈرتا ہے اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ جس کو مخالفین کے لشکروں کی تعداد اور مال و دولت کی کثرت مرعوب نہیں کرتی بلکہ اس کے عزائم کو اور بلند کرتی ہے اور وہ اللہ تعالے پر بھروسہ کر کے اور حسبنا اللہ نعم الوکیل پڑھتا ہوا جہاد کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ بندۂ مومن موت سے ہرگز نہیں ڈر سکتا۔ اس کو یہ معلوم ہے کہ راہِ خدا میں مرنے والا زندہ جاوید ہوتا ہے۔ اُسے صبح و شام جنت کی غذائیں ملتی ہیں۔ وہ ابدی سعادت سے مستفید ہوتا ہے اور اسے اپنے رب کی نعمت و خوشنودی کا تاج پہنایا جاتا ہے۔ بندۂ مومن غیر اللہ سے کیسے ڈریگا جبکہ یہ خداوندی حکم ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ فلا تخافوھم وخافون اِن کنتم مومنین (اگر تم سچے مومن ہو تو دشمنوں سے مت ڈرو مجھ سے ہی ڈرو)۔

اب ہر مسلمان کا فرض ہے کہ شیطانی وسوسوں کی پیروی چھوڑے۔ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے اپنے دل کا امتحان لے۔ جب نہ کسی کی دوستی کام دے گی نہ سفارش اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں اور جن چیزوں کو ایمان کے لوازم میں شمار کیا ہے اپنے اعمال کو ان اوصاف و لوازم کے مطابق بنائیے جب ہم میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس فریضہ کو سرانجام دے دے گا تو ہم پر راہِ ہدایت کھل جائے گی اور ہم خدا کے قانونِ عدل کے ثمرات

سے دوبارہ لطف اندوز ہونے لگیں گے۔ سبحان اللہ ہماری قوم ایک متحدہ قوم ہے۔ اس کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کا اہتمام خصوصاً اس وقت جب کہ اجنبی طاقتیں ظلم و تعدی پر آمادہ ہوں۔ ایک اہم دینی فرض ہے۔ کتاب الٰہی اور سلف و خلف کا اجماع دونوں اس پر گواہ ہیں لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اغیار ممالک اسلامیہ پر پے در پے حملے کر رہے ہیں اور ایک ایک حکومت باری باری زیرِ تصرف لا رہے ہیں۔ ایمان کے نام سے موسوم ہونے والے ہر سرزمین پر مقیم ہیں اور دنیا کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن کسی کو بھی دین کے نام پر جوش نہیں آتا اور کسی کی غیرت اُسے دین کی حمایت کے لئے نہیں اُبھارتی۔

اے قرآن کا دعوےٰ رکھنے والو! جب تک قرآن کو قائم نہ رکھو گے اس کے اوامر و نواہی پر سختی سے عمل نہ کرو گے اور اپنے سلفِ صالحین کی طرح عمل میں دانائی و حکمت کے لحاظ کے ساتھ اپنے پورے عمل و کردار میں قرآن کو پیشوا نہ بناؤ گے اس وقت تک تم قرآن کے مستحق ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اے قرآن والو! قرآن تمہارے سامنے ہے پڑھ لو:۔

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ٥

(تو جب کوئی محکم سورت نازل ہوئی اور اس میں قتال کرنے کا ذکر ہوا تو آپ ان لوگوں کو دیکھیں گے جن کے دل میں بیماری ہے کہ وہ آپ کی طرف ایسی نظریں اٹھائیں

گے۔ جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہوا

کیا تم نہیں جانتے کہ یہ آیت کس کے بارے میں اُتری ہے؟ انہی کے بارے میں جن کے پاس ایمان نہیں ہے۔ کیا کوئی مومن اس بات سے خوش ہوگا کہ منافقوں کے اوصاف اس میں پائے جائیں؟ یا بہت سے مدّعیان ایمان ان بداعمالیوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے۔ جو شیطانی جماعت نے ان کے سامنے مزین کیے اور نفسانی خواہشات نے انہیں حسین و جمیل اشکال میں پیش کیا۔

اگر ایمان کا سب سے پہلا کام دین کے راستے میں مال و جان کو پیش کرنے کی جرأت پیدا کرنا ہو، اگر مسلمان ایسے کام کو سرانجام دینے میں عذر اور بہانے تلاش کر رہا ہو تو میں سچ کہتا ہوں اور بلاخوف تردید کہتا ہوں کہ ایمان اس مسلمان کے دل تک نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ کی امداد سے جی چرانے کی جو تاویل بھی پیش کی جائے وہ نفاق کی نشانی اور اللہ سے دور ہونے کی علامت ہے۔

ان تمام حالات کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخبار و احادیث پر کامل ایمان رکھتے ہوئے ہم یقین کرتے ہیں کہ اس امّت میں خیر و برکت کے آثار قیامت تک رہیں گے اور یہ قوم صفحۂ ہستی سے ہرگز فنا نہ ہوگی۔ ہمیں اُمید ہے کہ موجودہ دور میں راہِ حق سے جو انحراف نظر آ رہا ہے وہ عارضی ہے اگر پرہیزگار اور خدا ترس علما اٹھیں اور اللہ اور اُس کے رسول کی راہ میں مسلمانوں کی سچی خدمت کر کے اپنا فرض سرانجام دیں، قرآن کی روح کو زندہ کریں اور اس

کے بلند و برتر معانی کے ذریعے ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کے وعدۂ برحق کی طرف مبذول کریں تو بہت جلد صاف نظر آ جائیگا کہ حق بلندی پر جا رہا ہے اور باطل تنزل پذیر ہے۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے والی امید کی ایک روشنی نظر آئے گی اور عمل کا وہ جوش پیدا ہوگا جس کو دیکھ کر عقلیں دنگ رہ جائیں گی۔

بیداری کی ایک لہر جو ان دنوں ہمیں اکثر ممالک کے مسلمانوں میں پیدا ہوتی نظر آ رہی ہے۔ یہ بشارت دے رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار کر دیا ہے جو تمام فرزندان توحید کو ایک رشتے میں پرونے اور ایک مرکز پہ جمع کرنے کے لئے بلند کی گئی ہے۔

اگر مسلمانوں نے اللہ تعالےٰ کی طرف سے عائد کردہ فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اتفاق کر لیا تو وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو از سر نو حاصل کر لیں گے۔ اور ان کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی مومنوں پر بڑی وسیع ہوا کرتی ہے۔ اب علماء کا یہ فرض ہے کہ اس کار خیر کے لئے تیزی سے آگے بڑھیں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں کہ یہی خیر کامل ہے۔ اور پوری پوری فضیلت کا مستحق وہی ہوگا جو اس پر عمل کرنے میں ابتدا کی سعادت حاصل کرے۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا۔ (جسکو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے۔ وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسکو اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اسکے لئے تم کوئی ہادی اور راستہ بتانیوالا نہ پاؤ گے۔)

مسلمانوں کا ماضی اور حال

اور

انکے امراض کا علاج

سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تبدیلا

(گذرے ہوئے ایّام میں یہ خدا کی سنّت جاریہ ہے اور تم سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے)

کیا آپ نے اس قوم کا حال سنا ہے جو پہلے کسی شمار و قطار میں نہ تھی اور اتفاقاً اس پر سے عدم کے پردے اور تاریکیاں پھٹ گئیں۔ اس کے پراگندہ افراد میں جوش پیدا ہوا اور انہوں نے متفقہ طور پر غیرت سے کام لے کر اپنے قومی وجود کی ایسی عمارت تعمیر کی جس کی ترتیب دلربا، دیواریں محکم اور بنیادیں بے اندازہ مضبوط تھیں۔ اس کے اردگرد بہادری اور شجاعت کی خاردار فصیل کھینچی گئی تھی۔ نڈر سورماؤں کی ہمتیں اس کے چاروں طرف حصار کا کام دے رہی تھیں۔ حوادث کے تیز و تند جھونکے اس کے میدان میں پہنچ کر تھم جاتے تھے۔ اس کے سردار اور سپہ سالار اپنے ناخنہائے تدبیر سے مشکلات کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔ اس کی فضا میں شجر عزت توانا اور سرسبز تھا اور اس کی قوت و شوکت کی دھاک دور و نزدیک ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی یہاں تک کہ اس کے آداب اور طریقے برتری اور بہتری کے لحاظ سے ضرب المثل بن

گئے تھے - اور اُس کے اخلاق و عادات اپنے اور پچھلے زمانے کے اخلاق و عادات پر چھا گئے تھے - چنانچہ تمام قوموں کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے آداب اور طریقوں پر چلے اور ان کے آئین و قوانین کی پابندی کئے بغیر سعادت کا حصول ناممکن ہے - اپنی قلیل تعداد کے باوجود اس قوم کا میدان عمل اتنا وسیع تھا کہ وہ سارے عالم کے لئے روح مدبرہ کے قائم مقام تھی - اور عالم اس کے تصرف میں بمنزلہ بدن معلوم ہوتا تھا۔

ترقی کا یہ کمال حاصل کرنے کے بعد اس قومی عمارت کی بنیاد کمزور ہو گئی اس کی تنظیمی قوت کا رشتہ ٹوٹ گیا اور اس کے افراد بکھر گئے - ان کے اغراض اور مفادات مختلف ہونے کی وجہ سے ان کا باہمی اختلاف بڑھ گیا - اور ان کی مجتمع قوتیں پراگندہ ہو گئیں - اور ان میں سے ہر فرد کے عزائم قومی زندگی کی حفاظت کے اسباب سے ہٹ کر اپنی شخصیت اور انفرادی وجود کو برقرار رکھنے پر مرکوز ہو گئے - آج ان افراد کی نظریں پہنائے عالم کی سیر میں مشغول ہیں مگر ان مناظر میں قوم کے کلی یا جزئی حقوق کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی - حتیٰ کہ وہ اس حقیقت سے بھی غافل ہیں کہ ان کی اپنی ضروتیں بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں پوری ہو سکتی ہیں۔ جو قومیت اور رسم و آئین میں ان کے ساتھ اشتراک رکھتے ہیں - اور اس لئے انہیں اپنے بازوؤں کو قوت دینے سے زیادہ ان کے دست و بازو کو مضبوط کرنے اور اپنا رزق بڑھانے سے زیادہ ان کے اموال و دولت میں اضافہ کرنے

کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس غفلت کی وجہ سے وہ اپنے دن رات ایک قسم کی نیم خوابی میں گزار رہے ہیں۔ اور اس حالت کو بیداری سمجھ رہے ہیں۔ انہیں درحقیقت ایک طرح کی لاغری لاحق ہے جسے وہ دھوکے میں پڑ کر جسم کا نکھار اور جوبن سمجھ رہے ہیں۔ قنوطیت اور یاس نے ان مدہوشوں کی امیدوں پر پانی پھیر کر انہیں ختم کر دیا ہے۔ اور ان میں ادنیٰ قسم کی قناعت اور ذلّت وخواری پر رضامندی پیدا ہو گئی ہے۔ اب اگر کسی کے خیال میں حق کی جھلک پیدا بھی ہوتی ہے یا اس کے دل کی اندرونی آواز اس کو ایسے اسباب کے اختیار کرنے پر ابھار بھی دیتی ہے۔ جس سے قوم شرفِ رفتہ کو حاصل کر سکے تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید میرے دماغی ضعف یا جسمانی کمزوری کی وجہ سے میرے دماغ میں ایسے ایسے وسوسے پیدا ہوئے اور اگر کبھی اپنے ان خیالات کی صحت کا یقین بھی کر لیتا ہے تو اسے یہ خدشات لاحق ہو جاتے ہیں کہ وقت کی پکار پر لبیک کہنے کے بعد مجھے مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہلاکت کے مواقع دیکھنے پڑیں گے۔ اور میری زندگی کے اس انقلاب سے میری نعمت کے زوال اور معشیت کی کدورت کے اسباب قریب تر ہو جائیں گے۔ اِن تصوّرات نے اس کے لئے بزدلی اور ناامیدی کی مضبوط بیڑیاں تیار کیں۔ اس کے ہاتھ اور اس کے قدم جدوجہد کرنے سے رُک گئے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اپنے خیر و صلاح کے ہر عمل سے بہت ہی عاجز سمجھنے لگا۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کی حقیقت سمجھنا اس کے

لئے بہت ہی مشکل ہو گیا۔ اس کے ان پیشروؤں نے جن جن مفاخر و فضائل اور علاقات و مملکت کو حاصل کیا اور اپنے اخلاف کے سپرد کر کے انہیں متولی اور اپنا جانشین بنایا اس کی نظرِ ادراک ان کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے سے تو کیا سمجھنے سے بھی قاصر رہی۔ یہ مرض اس قوم میں اس حد تک پہنچ گیا کہ اب وہ عالم نزع میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہے اور ہر گھڑی کسی نئے درندے کا شکار بنی ہوئی ہے۔

ہاں میں نے ایسی بہت سی قومیں دیکھیں جن کا پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بن گئیں۔ بامِ ترقی کے بلند میناروں پر چڑھ گئیں اور پھر زوال اور پستی سے دوچار ہوئیں۔ قوت حاصل کر کے دوبارہ کمزور ہوئیں۔ عزت کا تاج سر پر رکھ کر پھر قعرِ مذلت میں گریں۔ صحت اور تندرستی کی دولت پا کر پھر بیمار ہو گئیں لیکن کیا دنیا میں کوئی مرض ایسا ہے جو لاعلاج ہو؟ کبھی نہیں!

مگر ہائے افسوس! کتنا پیچیدہ ہے یہ مرض! کتنی نایاب ہے اس کی دوا اور کتنے کم یاب ہیں اس کے علاج والے! یہ آواز جو تقسیم ہو کر اور مختلف سروں میں بٹ کر بے آہنگ ہو گئی ہے۔ دوبارہ کس طرح ہم آہنگ بنائی جا سکے گی۔ آج ہر شخص کی زبان پہ نفسی نفسی ہے۔ اور اسی نفسی نے یہ افتراق پھیلایا ہے کہ خدا کی پناہ بھالانکہ اگر ہر شخص اس نفسی نفسی کی حقیقت کو سمجھتا اور اپنے معاملہ کے خیر و صلاح کا واقعی خواہاں ہوتا تو اپنے بھائیوں سے کبھی جدا نہ ہوتا، کیونکہ اِس کے بھائی تو اس کے اعضا میں سے ہیں جن کا رشتہ اس کے ساتھ بہت قوی اور مضبوط ہے۔ لیکن اس

کے برعکس وہ ان بھائیوں کے مقاصد کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے اور ان کے مفاد کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ہر جاندار میں فطری طور پہ غذا کے ذریعے زندگی کو برقرار رکھنے کا جذبہ موجود ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم کے ہر فرد کو بھی اس جذبہ کا احساس ہونے لگا ہو، مگر یہ پتہ کسی کو نہیں کہ اس قومی زندگی کے لئے غذا کہاں سے حاصل کی جائے گی۔ اور کسی طرح حریفوں کی دستبرد سے محفوظ رکھی جائے گی۔ لیکن مردہ ہمتوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے جبکہ ان کی موت آئی ہی اس وجہ سے ہو کہ وہ اپنے معالی و معارج کو بھلا کر پست اعمال میں آرام محسوس کرنے لگی تھی۔ کیا ایسے بھٹکے ہوئے مسافر کو سیدھی راہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو کعبہ کے بجائے ترکستان کی طرف جا رہا ہو اور بتانے اور سمجھانے پر بھی اسی راستہ پر چلنا حصول مراد کا واحد ذریعہ سمجھتا ہو۔ کسی سوتے ہوئے شخص کو اس وقت کیسے جگایا جا سکتا ہے۔ جب اس کے کان بہرے اور اعضائے سُن ہو چکے ہوں جس قوم کے افراد دور دور پھیلے ہوئے ہوں جس کے ممالک کے ساحل و کنارے میں ہزار ہا میل کا فاصلہ ہو اور جس کے عادات و خصائل آپس میں کافی اختلاف رکھتے ہوں اس کے منتشر افراد کے دلوں کو ہلا دینے کے لئے کہیں سے صور اسرافیل مل جائے گا؟ اور ان کے متفرق مقاصد اور مخالف آرا میں یک جہتی اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے کوئی بھی وعظ کارگر ہو سکے گا؟ خصوصاً جبکہ ان کے دلوں پر جہل کے گھٹا ٹوپ بادل چھائے ہوئے ہوں اور ہوش و حواس کی یہ حالت ہو

کہ ہر قریب کی شے دور نظر آ رہی ہو اور سہل سے سہل کام میں بھی مشکلات کا خطرہ نمایاں ہو۔ لہٰذا یہ ایک بہت ہی پیچیدہ مرض ہے جس کا علاج کسی حاذق کے بس کا نہیں۔

کسی مرض کے علاج کا تعین اسی وقت ممکن ہے جب اصل مرض اس کے ابتدائی اسباب اور بعد کے عوارض کا صحیح پتہ چل سکے۔ اسی طرح قومی مرض کا علاج اسی وقت ہو سکتا ہے جب قومی مرض کے علل و اسباب معلوم ہوں جب قوم کی عمر کو معلوم کر کے ان حالات و اطوار کا گہرا مطالعہ کیا جائے جو بدل بدل کر قوم کو پیش آتے رہے اور جن میں قوم نے آج تک زندگی بسر کی ہے۔

جس طرح جسمانی امراض کا علاج کوئی طبیب نہیں کر سکتا جب تک اس کی زندگی کی روداد اس کے سامنے نہ ہو۔ کہ مرض کی حقیقت صرف اسی طریقے سے معلوم ہو سکتی ہے کیونکہ بعض امراض ایسے ہیں جن کے جراثیم تو عمر کی کسی ابتدائی منزل میں جسم میں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن جب تک ان پر طبیعت غالب رہتی ہے اس وقت تک وہ اپنا اثر نہیں دکھا سکتے مگر عمر کی کسی دوسری منزل میں پہنچکر وہ طبیعت پر غالب آجاتے ہیں اور مرض اپنی اصل شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر طبیب کے لیے مریض کی سابقہ زندگی کے حالات کو معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جب کسی ایسے شخص کے مرض کی تشخیص جس کی عمر کے سال انگلیوں پر گنے جا سکتے ہوں اور جس کی زندگی کے احوال و عوارض بہت ہی محدود ہوں دشوار

ہے تو ایسی قوم کا علاج اور بھی مشکل ہو گا جس کی رودادِ زندگی بہت طویل اور افراد کی تعداد بہت کثیر ہے۔ اسی لئے مدتوں کے بعد شاذ و نادر ہی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو کسی قوم کو زندہ کرنے یا اس کی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لانے کا عظیم الشان کام سرانجام دیتے ہیں۔ نقلی اور نمائشی لیڈر دنیا میں بے شمار پیدا ہوتے رہتے ہیں جو کچھ نہ جاننے کے باوجود قوم کے مسیحا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کی مثال بالکل اناڑی اور عطائی طبیبوں کی طرح ہے۔ جس طرح اناڑی طبیبوں کا علاج مرض کو گھٹاتا نہیں بڑھاتا ہے اور بسا اوقات مریض کی جان تک کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ قوم کے حالات اس کے مرض کے اسباب اس کی اقسام، قوم کے عادات و خصائل، افراد قوم کے مذاہب و اعتقادات، اُن پر آنے والے پے در پے حوادث، ان کے مساکن کے جغرافیائی حالات، ان کی بلندی و عروج کا ابتدائی مقام، ان کی پستی و تنزل کے موجودہ حالات اور ان دونوں نقطوں کے درمیان ان کے اقبال و ادبار کے مختلف ادوار سے پوری پوری واقفیت حاصل کئے بغیر کسی قوم کی اخلاقی اصلاح کی ذمہ داری لیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں کیونکہ قومی اخلاق کی اصلاح ان اشیا کی حقیقت پر مطلع ہوئے بغیر ناممکن ہے۔ اور کسی ایک حقیقت کو غلط سمجھنے کی بنا پر علاج اُلٹا مرض کو بڑھانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

جس شخص کو کمالِ انسانی کا کچھ حصہ ملا ہو اور اس کے دل میں الہامِ الٰہی

کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی باقی ہو۔ وہ قوموں کی تربیت اور اصلاح کی ذمہ داری اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک اسے اپنی ذات کے بارے میں یہ اطمینان نہ ہو کہ وہ اس عظیم الشان فرض کو سرانجام دینے میں ہر قسم کے علمی اور عملی کوتاہیوں سے بالکل مبرا ہے۔ اس قسم کا غیر ذمہ دارانہ اقدام صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو غلط تعلیوں کے ذریعہ اپنی اہمیت کو منوانا چاہتے ہیں اور ان اعمال کی آڑ میں عیش و راحت تلاش کرتے ہیں جن کے حقوق ادا کرنے کی اہلیت سے وہ یکسر خالی ہیں۔ اس زمانے میں بعض لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ قومی امراض کا علاج اخبارات و رسائل کی اشاعت سے کیا جا سکتا ہے اور وہ صحافت کو ہی قوموں کے عروج دینے، ان کے افکار کو بیدار کرنے اور ان کے اخلاق کو استوار کرنے کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اوّل تو یہی فرض کرنا مشکل ہے کہ جرائد نگاروں اور مدیران صحائف کا مقصد خود غرضی سے خالی اور صرف فلاح اُمت پر مبنی ہوتا ہے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے تو موجودہ وقت میں جبکہ غفلت اور لاپروائی کا دور دورہ ہے۔ عقول و افکار۔ دہشت اور تحیّر کے جنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد بہت محدود ہے ان جرائد کو پڑھنے والے کہاں ملتے ہیں۔ پڑھنے والے مل بھی جائیں تو سمجھنے والے عنقا ہیں۔ سمجھنے والوں کا یہ حال ہے کہ یا تو ان کے تصوّرات کی دنیا بہت محدود ہے یا وہ خود اپنے افکار و آرا میں مگن ہیں اور لکھنے والے کے مقصد کو ہی چھوڑ کر اس کے الفاظ کو اپنے

خیال کا تابع اور مؤیّد بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جرائد اور اخبار اچھے اثرات کی بجائے بُرے اثرت پیدا کرتے ہیں اور ناموافق غذا کی طرح چند در چند طریقوں سے نقصان کو اور بڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب افرادِ قوم کی ہمتیں تنزل اور پستی کے گڑھے میں گرتی جا رہی ہوں تو ان کو اخبار کے فوائد سمجھانا اور اخبار کے مضامین کے لئے ان میں دلچسپی پیدا کرنا اس قلیل مدت اور چند در چند حوادث کے ماحول میں کس کے بس کی بات ہے۔ تمہارے حقوق کی قسم یہ کام مشکل اور بہت ہی مشکل ہے۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے، کہ زمین کے وسیع و عریض حصّے میں پھیلی ہوئی یہ قوم اغراض و مقاصد کے اختلافات میں اُلجھے رہنے، ذلیل ترین زندگی پر رضامند ہونے اور ایک ایسی جماعت کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرنے کے باوجود جو نہ صرف جنس و مسلک میں ان کے خلاف ہے بلکہ کسی زمانے میں ان کی تابع فرمان بھی رہ چکی ہے۔ ان مہلک امراض سے کلّی طور پر شفایاب ہو سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ تمام اسلامی ممالک میں پرائمری مدارس قائم کئے جائیں جو جدید یورپین مدارس کے طرز پر ہوں تاکہ تھوڑی ہی مدت میں لوگوں کے اندر علوم و معارف عام ہو جائیں اور جب یہ معارف عام ہو جائیں گے تو اخلاق بھی مکمل ہو جائیں گے۔ قومی آواز بھی ایک ہو جائے گی اور قوم کی قوتیں بھی ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گی۔ کتنا دور از کار ہے یہ خیال! اتنا بڑا کام کسی ہیئتِ حاکمہ ہی کے ذریعہ سرانجام پا سکتا ہے

جو اپنے قوی پنجۂ اقتدار سے قوم کو اس کام کے لئے مجبور کرے۔ پھر جب قوم اس کی لذت سے آشنا ہو جائے اور اس کے ثمرات سے متمتع ہو کر اس کی طرف سچّی رغبت سے توجّہ کرنے لگے تو یہی توجّہ اس قوت قاہرہ کے قائم مقام ہو کر اس خیر و برکت کو نافذ کرنے کا کام دے گی۔ جس کا اجراء ہیئتِ حاکمہ کو منظور تھا۔ اس کے علاوہ ان مدارس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے بے اندازہ دولت کی ضرورت ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں یعنی ہیئتِ حاکمہ کا تسلط اور وسیع خزانہ کا وجود ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہم قوم کے ضعف اور پستی کا علاج سوچ رہے ہیں۔ ضعف اور پستی کی حالت میں تسلّط و ثروت ناپید ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ دونوں چیزیں کسی قوم کے قبضہ میں آجائیں تو اُسے کمزور ہی کون کہے گا۔

ممکن ہے کہ اس تجویز کے حق میں رائے دینے والے کہیں کہ ہم پیہم کوشش اور استقلال کے ذریعہ بتدریج اسے عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ غلط نہیں لیکن جن زبردست قوموں کا مقابلہ ہمیں کرنا ہے وہ اپنے لالچ کے جوش میں پوری قوت سے کمزور قوموں کی ترقی کے راستے مسدود کرنے پر تلی ہوئی ہیں اور کسی طرح بھی اس کی روادار نہیں کہ کمزوروں تک بھی اقتدار کی خوشگوار ہوا کے چند جھونکے پہنچ سکیں۔ ایسی حالت میں ان حوصلہ فرسا اور صبر آزما وسائل کی کامیابی کے لئے وقت کب ہاتھ آسکے گا؟

فرض کرو زمانہ نے صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھا کر قوم کو اتنی مہلت عطا کر دی

جس ہی وہ ان علوم کو اپنے چند افراد میں پھیلا سکے اور آہستہ آہستہ انہیں ترقی دے سکتے لیکن کیا یہ تدریجی رفتار قوم کو حقیقی فائدہ پہنچا سکے گی اور کیا ان چند افراد کے حاصل کئے ہوئے علوم قوم کو مناسب کمالات کے لئے تیار کر سکیں گے؟ اور کیا ان علوم کے ذریعے وہ اپنے باقی بھائیوں کی رہنمائی کر سکیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی تو قوم ان اجنبی علوم کی ماہیت دریافت کرنے سے کوسوں دور ہے ابھی تو اسے یہ پتہ نہیں کہ ان علوم کی تخم ریزی کس طرح کی گئی، کس طرح یہ پودے اُگے، کیسے ہرے بھرے ہوئے اور کس طرح ان کی فصل پکی اور کیسے انہوں نے پھل دیا، ان کو پانی کہاں سے بہم پہنچایا گیا اور کس مٹی سے انہیں غذا دی گئی۔ قوم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ان علوم کی ایجاد کے وقت انتہائی مقاصد کیا پیش نظر رکھے گئے تھے۔ اور ان پر کون سے ثمرات مرتب ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں اس بارے میں قوم کی معلومات بہت محدود ہیں۔ ان حالات میں ان علوم کا چند افراد کو ایک دم سکھانا اور ان کے ذہنوں کو جو اس وقت دوسرے خیالات سے بھرے ہوئے ہیں ان کے خزانوں سے مالا مال کرنا، ان کے افکار و اخلاق کو استوار کر کے کہاں تک اپنے بھائیوں کو فائدہ پہنچانے کے قابل بنا سکے گا۔

اس کے برعکس قرین قیاس یہی ہے کہ ان سے قوم کو اُلٹا نقصان پہنچے گا کیونکہ یہ نئی پود جو ایسے علوم کی فضا میں نشو ونما پا چکی ہو جن کے چشمے خود ان کے سینوں سے نہیں اُبلے اگر اپنے ملک و وطن کی سچی خدمت سرانجام دینا بھی چاہے گی تو نہیں دے

سکے گی ۔ یہ لوگ جو نئے نئے علوم سیکھیں گے وہ بعینہٖ اسی طرح دوسروں تک پہنچا دیں گے ۔ جس طرح انہوں نے اپنے اساتذہ کی زبانی سُنے ہوں گے ۔ اس معاملہ میں وہ قوم کے خیالات و آراء طبائع اور عادات کا کوئی لحاظ نہیں رکھیں گے اور انہیں خلاف وضع استعمال کریں گے ۔ چونکہ انہیں ان علوم کی اصلیت سے بعد ہو گا۔ اور وہ ان کے حال میں محو ہو کر ان کے ماضی اور مستقبل سے بے خبر ہوں گے۔ وہ ان کو اسی حالت میں ہر شخص کے لئے زندگی کا تنہا سرچشمہ سمجھیں گے ۔ جس حالت میں انہوں نے یہ حاصل کئے ہوں گے ۔ اس لئے وہ چھوٹے چھوٹے مسائل سے وہ نتائج حاصل کرنا چاہیں گے جو بڑے بڑے مسائل سے ہی حاصل ہو سکتے ہوں۔ اور بڑوں سے وہ جو چھوٹوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں انہیں صرف اپنے حاصل کردہ علوم کی شکلوں سے سروکار ہو گا ۔ اور جن لوگوں کے سامنے انہیں پیش کرنا ہے ان کی استعداد کے بارے میں وہ کبھی نہ سوچیں گے کہ آیا ان کی طبیعتوں پر یہ علوم کوئی قابلِ تعریف اثر کریں گے یا ان کے موجودہ امراض کو اور بڑھا دیں گے۔ اور یہ ساری خرابیاں اسی لئے پیدا ہوں گی کہ وہ ان علوم کے مالک یا مخترع نہیں بلکہ ناقل ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی عنایت سے کسی کو سمجھنے کی توفیق دے تو اور بات ہے۔ ورنہ عموماً ان لوگوں کی حالت اس ماں کی طرح ہو گی جو مامتا سے اندھی ہو رہی ہو کہ جہاں اسے کوئی غذا لذیذ معلوم دے وہی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھی کھلا دے

نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے کے کمزور اعضا اس غذا کو ہضم و جذب کرنے سے قاصر رہیں گے اور وہ جلد ہی مرض کا شکار ہو کر ہلاکت میں پڑ جائے گا۔ چنانچہ ان نئے تعلیم یافتہ اشخاص کے وجود کی مثال قوم میں ایک تحلیل کرنے والے کیمیاوی مادے کی طرح ہو گی جو جماعت کے رہے سہے اتحاد کو بھی پارہ پارہ کر دے گا بعض قومی روابط جو امراض فاسدہ کی زد سے محفوظ رہ گئے ہیں وہ بھی ان کی زد میں آجائیں گے کیونکہ یہ فریب خوردہ جماعت قوم کے سامنے وہ مسائل پیش کرے گی جن سے وہ ان تعلقات و روابط کی طرف سے غافل ہو جائے گی، یہ تو اپنے خیال میں صرف خیر اور نفع ہی کا ارادہ کریں گے لیکن قوم کے افراد پر اس کا اثر مضر ہی پڑے گا۔ اختلافات کی خلیجیں زیادہ وسیع ہو جائیں گی اور قوم کی توجہ ہٹ جانے سے ان کے روابط کمزور ہو جائیں گے اور آخر کار اجنبیوں کو خیر خواہی اور اصلاح کے نام پر ان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ اس طرح وہ قوم کو بقا سے فنا اور ہستی سے نیستی کی طرف لے جائیں گے۔ وبئس المصیرہ

عثمانیوں اور مصریوں نے طرز جدید پر چند مدارس تعمیر کئے اور اپنے کئی وفد یورپی ممالک اس غرض سے بھیجے کہ وہاں ان کے پاس علوم و معارف، آداب، صنائع کے اور ہر اس چیز کے جس کا نام ان فریب خوردوں نے تہذیب و تمدن رکھا ہے پلندے لاد کر پہنچا دیئے جائیں۔ حالانکہ یہ تہذیب ان کی نہیں بلکہ ان ممالک کی ہے جہاں وہ اپنے طبعی نظام اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے مطابق

بنی اور پھلی پھولی ہے۔ مصریوں اور عثمانیوں کو یہ علوم حاصل کیے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا انہوں نے ان سے کوئی فائدہ اٹھایا؟ اس جدید "حبل متین" کو تھامنے سے پہلے ان کی جو حالت تھی کیا ان کی موجودہ حالت اس سے کچھ زیادہ بہتر بنی؟ کیا انہوں نے فقر و فاقہ کے پنجہ سے اپنے آپ کو چھڑا لیا؟ اجنبی طاقتیں اپنی ریشہ دوانیوں کے ذریعہ انہیں آئے دن جن ناگفتہ بہ حوادث میں مبتلا کرتی رہتی ہیں کیا وہ ان تعلیمات کے ذریعے ان کے عواقب اور مہلکات سے بچ گئے کیا انہوں نے اپنے قلعوں کو محفوظ اور سرحدوں کو مضبوط بنا لیا؟ کیا اس کے ذریعے انہیں اتنی فوج اور اتنا لشکر مل گیا کہ وہ دشمنوں کی لوٹ کھسوٹ کی روک تھام کر سکیں؟ کیا وہ عواقب کے بارے میں اتنے دور بین اور آراء و افکار میں اتنے پختہ ہو چکے کہ اب حرص و آز کے بندوں کو ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو۔ کیا ان میں ایسے لوگ پائے جانے لگے جو ملکی مصلحت کو باقی سارے مصالح پر ترجیح دیتے ہوں۔ اور ہمہ وقت اسی کی طلب میں مشغول رہتے ہوں۔ اور اگر کبھی انہیں اس بلند مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے لیلائے شہادت سے ہم آغوش ہونا پڑے تو ان کے بعد ان کے مقصد کو انجام تک پہنچانے کے لئے انہی جیسے سچے اور بے لوث افراد ان کے قائم مقام بن جائیں۔ کیونکہ بہت سی زندہ قوموں کی یہی عادت رہی ہے۔ لبا اوقات چند ایسی ہستیاں نظر آنے لگتی ہیں جو حریت، وطنیت، نسل

اور قومیت اور اسی قسم کے دیگر الفاظ کی رٹ لگائے رہتی ہیں اور چند بلے سرو پا اور ادھورے جملوں میں ان الفاظ کو بار بار دوہراتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو قائدِ حریت اور اسی قسم کے دیگر خود ساختہ اور حسب خواہش القاب سے ملقّب کرتے ہیں۔ اور اس پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ انہی میں چند ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے حاصل کردہ علوم پر "عمل" کرنے کے جوش میں اپنے گھروں کے نقشے بدل دیئے کھانے پینے کے طریقوں، لباس، فرش، ظروف اور دیگر چھوٹے چھوٹے سامانِ معیشت کو تبدیل کر ڈالا۔ اور ان چیزوں کو اجنبی ممالک کا بہترین نمونہ بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی کو اپنے مفاد کے اسباب میں شمار کیا۔ اور اسی میں اپنی تمام دولت و ثروت صرف کر کے دوسرے ممالک میں پہنچا دیا۔ اور اس کے بدلے میں آرائش اور زینت کے وہ فانی سامان حاصل کیئے جن کی ظاہری ہئیت تو بہت نظر فریب ہے مگر جن کی پائیداری کی تعریف کبھی نہیں کی جاسکتی۔ اس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنّاعوں کو ختم کر دیا۔ اور گھریلو صنعتوں سے روزی کمانے کے راستے مسدود کر دیئے کیونکہ ان تمام لوازم کا مہیا کرنا جن کی ان نئے علوم کو ضرورت تھی۔ ان صنّاعوں کی وسعت وطاقت سے باہر تھا۔ ان بیچاروں کے کارخانے طرزِ جدید میں تبدیل نہیں ہوئے تھے اور ان کے پاس اپنی صنعتوں کو کارآمد اور خوشحال بنانے کے ذرائع موجود نہ تھے۔ نہ ان کے پاس اتنا اثاثہ تھا کہ دوسرے ممالک سے جدید طرز

کے آلات منگا کر اپنا کاروبار صحیح پیمانے پر چلا سکیں۔

اس طرح قوم کی ناک کاٹی جا رہی ہے۔ اور یہ سارے نتائج اس لئے پیدا ہو رہے ہے کہ یہ علوم ان تک اپنے طبعی وقت سے ذرا پہلے پہنچا دیئے گئے اور ان کے ہاں ان کی بنیاد غلط طریقے پر ڈالی گئی ہے۔

پچھلے واقعات اور تجربات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قوم کے وہ لوگ جو دوسرے کے عادات و خصائل کو اپنا کر اندھا دھند ان کی تقلید کرتے ہیں، دشمنوں کے لئے قوم کی عمارت میں روشندانوں اور کھڑکیوں کا کام دیتے ہیں جن کے ذریعہ دشمنوں کو داخل ہونے کا راستہ ملتا ہے۔ ان کے اذہان وافکار، وسوسوں اور مکر و فریب کی فرودگاہ ہوتے ہیں چونکہ ان کے دل اِن لوگوں کی تعظیم و توقیر اور ہمدردی کے جذبے سے پُر ہوتے ہیں۔ جن کی وہ تقلید کر رہے ہوتے ہیں اس لئے جو لوگ ان کے عادات و اطوار پر نہیں چلتے وہ انہیں حقیر دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی قوم کے لئے بدبختی کا سامان ثابت ہوتے ہیں اس کی تذلیل کرتے اور اس کے افراد کے اعمال و اطوار کتنے ہی عظیم الشان کیوں نہ ہوں، ان کو قابلِ اہانت گردانتے ہیں۔ اگر قوم میں کچھ ایسے لوگ مل جائیں جن میں اولوالعزمی کا جوہر موجود ہو اور جو عظیم الشان مقاصد کو حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہوں تو یہ سب کے سب اکٹھے ہو کر ان پر پل پڑیں گے اور ان کو مٹانے اور دبانے کی پوری کوشش کریں گے۔ یہاں تک کہ بہادری کا نشان مٹ

جائے گا۔ اور آتش غیرت کی گرمی ختم ہو جائے گی۔ ایسی اندھی تقلید کرنے والے لوگ مخالفوں کی سپاہ کے لئے مقدمۃ الجیش یا پانچویں کالم کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے لئے راستہ ہموار کرتے ہیں اور پھر ان کے آلۂ کار بن کر ان کے قدم مضبوط اور ان کے تسلط اور اقتدار کی بنیادیں مستحکم کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ان کے نزدیک یہی لوگ علم و فضل اور ہنر کے تنہا مالک اور طاقت و قوت کا ناقابلِ تسخیر مرتبہ رکھنے والے ہیں۔

ہم کسی ملامت کرنے والے کے خوف سے بے نیاز ہو کر علی الاعلان یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر اس قسم کے "جاسوس" افغان قوم میں اُس وقت موجود ہوتے جس وقت انگریز نے اس کے بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا تو قیامت تک بھی افغانوں کو آزادی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ کیونکہ اس قسم کے "علم سیکھنے والوں" پر علم کا اثر اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے معلمین کی طرف مائل ہو کر ان کے لئے راستے ہموار کرنے میں مشغول و منہمک ہو جاتے ہیں اور ان علوم و فنون کی چمک دمک سے متاثر ہو کر ان کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ ان کے عقیدتمندی اور نیازمندی کے جذبات وابستہ کر لیتے ہیں اور دوسرے ابنائے ملت کو بھی ان کی طرف سے مطمئن کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور انجام کار نفرت اور غیظ و غضب کے ان جذبات کو زائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جس کے ذریعہ لوگ اپنے حقوق اور قومی وجود کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب

اجنبی طاقتیں کسی قوم کی سرزمین پر قبضہ کرنے کے خیال سے قدم رکھتی ہیں تو یہ لوگ آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اور ان کی آمد کو باعث سعادت سمجھ کر ان کی امداد کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو انہیں میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ اور ان کے تسلط کو اپنی آنے والی نسلوں کے لئے باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں۔

تو جب ہمارے جرائد کا یہ حال ہوا کہ اغراض و مقاصد کی صحت اور نیت کی صفائی کے باوجود ان کا اثر بہت سست ہے۔ اور علومِ جدیدہ کے نتائج یہ ہیں کہ غلط استعمال کی وجہ سے ان کے فوائد کے مقابلے میں نقصان کا ہی زیادہ اندیشہ ہے۔ تو پھر کیا تدبیر کی جائے۔ کیا وسیلہ سوچا جائے۔ وقت تنگ ہے اور مہم کڑی۔ ایسے میں کونسی گرجتی ہوئی آواز ہوگی جو غفلت کے نرم نرم گدیلوں پر سونے والوں کو بیدار کر سکے گی۔ وہ کون سی بجلی ہوگی جو جمود کے بستر پر آرام کرنے والی طبیعتوں کو حرکت پر آمادہ کرے گی۔ وہ کون سا صور ہوگا جو ان مردہ اجسام میں دوبارہ روح پھونک کر اس میدان میں لا کھڑا کرے۔ جہاں وہ اپنی فلاح و بہبود کے لئے معرکہ آرا ہو سکیں۔ یہ دور دور تک پھیلے ہوئے ممالک جن کی سرحدیں ایک دوسرے سے کافی فاصلوں پر واقع ہیں کیسے بیدار کئے جا سکیں گے۔ شرقی اور غربی، شمالی اور جنوبی اطراف کے رہنے والوں کے درمیان رسل و رسائل کے ذرائع بہت مشکل ہیں اور قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ یا تو اپنے قدموں پر

ٹکٹکی جمائے ہوئے ہے یا آسمان کے نظارہ میں مشغول ہے اس کی نظریں گرد وپیش اور یمین ویسار کے مطالعہ کے لئے بالکل حرکت نہیں کرتیں نہ اس میں کسی آواز کی طرف کان لگاکر سننے کی خواہش ہے اور نہ خیر وصلاح کی طرف مائل ہونے کی رغبت۔ ہر طرف حرص وہوس اور خود غرضی کی حکومت ہے اور وسوسوں اور بدگمانیوں کا دور دورہ۔

اس تنگ وقت میں ملت کے غم خوار کیا کریں۔ خطرات کے طوفان کی زد میں آنے سے بچنے کے لئے کیا علاج تلاش کریں۔ موت کے قاصدان کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں ایسی حالت میں زندگی اور موت کا کون سا ذریعہ تلاش کیا جاسکتا ہے میں اس بحث کو طول دینا اور بیان وتقریر کے لق ودق صحرا کی سیر کرانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک ایسے سبب کی طرف متوجہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں جو سارے اسباب کا مرجع ہے اور جس کے سامنے سارے وسائل جزئیات کا حکم رکھتے ہیں۔ ذرا اپنی فکر کو حرکت میں لاؤ اور دیکھو کہ جو قوم شہرت کے بعد گمنامی، قوت کے بعد ضعف، سیادت کے بعد غلامی اور مضبوط دفاع کے بعد ظلم وستم کا شکار ہوئی اس کی طاقت اس کی ترقی اور اس کے عروج کا راز کیا تھا۔ اس کی پہلی نہضت وارتقاء کے اسباب کیا تھے۔ اس کے بعد اس کے موجودہ امراض کے اسباب خود بخود منکشف ہو جائیں گے۔ جس چیز نے اس قوم کی آواز میں اتحاد پیدا کیا تھا۔ اس کے افراد کو بلند ہمتی کا سبق دیا تھا، انہیں باہم ایک رشتے میں منسلک

کیا تھا۔ ان کو عزت و شرف کے مقام رفیع پر پہنچایا تھا اور دوسری قوموں پر تفوق اور سربلندی عطا کی تھی۔ اور حکمت و تدبر کے زیور سے آراستہ کر کے قوموں کی سیاست کا نگہبان بنایا تھا۔ وہ دین تھا ایسا دین جو محکم اصولوں اور مضبوط بنیادوں پر قائم اور ہر قسم کی حکمت و عقل پر مشتمل ہے جو الفت و محبت کا پیغام بر ہے جو نفوس کا تزکیہ کرنے والا، دلوں کو اخلاقِ رذیلہ کے میل سے پاک کرنے والا اپنے احکام و اوامر کے مطلع پر حق و صداقت کا آفتاب چمکا کر عقلوں میں روشنی پیدا کرنے والا اجتماع انسانی کی بنیادی ضروریات کی کفالت کر کے اس کی ہستی کی حفاظت کرنے والا اور اپنے پیروؤں کو تہذیب و تمدن کے ہر شعبے کی طرف بلانے والا ہے۔

جب ترقی و سربلندی کے چشمے سے پانی لینے کے لئے اس قوم کے پاس واحد ذریعہ صرف دین اور مذہب ہی تھا۔ اور آب حیات پینے کے لئے وہ اسی گھاٹ پر اتری تھی تو ظاہر ہے کہ اس وقت اس کا تنزل و انحطاط صرف اصول دین کو چھوڑنے اور قواعد مذہب کو پس پشت ڈالنے کا نتیجہ ہے اور اس چیز کا نتیجہ ہے کہ معتقدینِ مذہب نے اپنی طرف سے بدعات ایجاد کر کے ان کو اصول ثابتہ کی جگہ دے دی اور دین نے جن حقائق کی طرف رہنمائی کی تھی جن مقاصد کی طرف بلایا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس غرض کے لئے دین کو پھیلایا تھا۔ ان سب کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہاں تک کہ اب صرف چند ناموں کا ورد کرنے اور چند

عبارتوں کو پڑھ لینے کا نام دین رہ گیا ہے۔ انہی بدعات نے قوم کے راستے میں حائل ہو کر اسے حق کی اس آواز کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا ہے جسے وہ کبھی کبھی اپنے پہلو سے اٹھتا ہوا محسوس کرتی ہے۔ پس قوم کے دکھوں کا کامیاب اور واحد علاج صرف یہ ہے کہ ہم اصول دین کی طرف دوبارہ متوجہ ہو کر اس کے احکام کو اسی شکل میں بجا لائیں۔ جس شکل میں وہ پہلے پہل آیا تھا۔ عوام و خواص کو اس کے ان نصائح و مواعظ کا پیغام سنائیں جن میں قلوب کی صفائی اور اخلاق کی تہذیب کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ غیرت اور اتحاد کی آگ کو تیز تر کرنے کی کوشش کریں۔ اور قوم کے وقار اور عزت کو بحال کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ چونکہ دینی جذبات مدتوں سے نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں کے ذہنوں میں گھر کرتے چلے آئے ہیں اور ان کے دلوں میں دینی اصول پر متحد ہونے کی خواہش اور مذہب کی محبت و عقیدت کی چھپی ہوئی چنگاری موجود ہے۔ اس لئے ان اصول پر احیائے امّت کی کوشش کرنے والے کے لئے صرف ایک پھونک مارنے کی ضرورت ہے جو اس کے اعضائے تنفس سے نکلتے ہی یک بہتی اتحاد و اتفاق اور دین کی الفت کی آگ تمام مسلمانوں کے دلوں میں پھیلا دیگی اور جس وقت مسلمان اس کام کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور دین حق کے اصول کو پیش نظر رکھ کر کامیابی کے راستے پر گامزن ہوں گے تو انہیں کمالِ انسانی کے منتہٰی تک پہنچنے سے کوئی چیز نہ روک سکے گی۔

جس قوم کے حالات ایسے ہوں جو ہم نے بتائے اور پھر بھی کوئی شخص ان کی اصلاح کے لئے اس وسیلہ یعنی دین کو چھوڑ کر کوئی دوسرا وسیلہ اختیار کرے. تو وہ یقیناً قوم کو صحیح راستہ سے ہٹا کر غلط راستے پر ڈال دیگا۔ اور انتہا کو ابتدا میں تبدیل کر کے بے ترتیبی پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ وجود کے نظام کی مخالفت کرے گا۔ اور اس کے لئے میانہ روی منعکس ہو جائے گی ایسا شخص امت میں نحوست ہی بڑھائے گا۔ اور صرف ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کر سکے گا۔

معزز ناظر! کیا تمہیں میرے اس بیان میں کوئی بات قابل تعجب نظر آتی ہے کہ دین کے وہ سچے اصول جو بدعتوں سے پاک ہوں۔ قوموں کے اندر اتحاد و اتفاق کی قوت پیدا کرتے انہیں زندگی کی لذتوں پر عزت و شرف کو ترجیح دینے کے لئے ابھارتے اور ان فضائل کو حاصل کر کے علوم و معارف کا دائرہ وسیع کرنے پر آمادہ کرتے اور اس طرح تہذیب و تمدّن کے انتہائی مدارج طے کر لیتے ہیں؟ اگر تمہیں تعجب ہوتا ہے۔ تو میرا تعجب تمہارے تعجب سے بھی زیادہ شدید ہے کیا تم عربوں کی تاریخ بھول گئے؟ دین کے پھیلنے سے پہلے وہ کیسے افتراق اور افتراق میں مبتلا تھے اور طرح طرح کے معاشرتی اور اخلاقی عیوب میں گرفتار تھے۔ اور پھر جب دین آیا تو کس طرح اس نے ان کو متحد و متفق کر دیا۔ قوت اور تہذیب سے آراستہ کیا۔ ان کی عقلوں کو روشن اور اخلاق کو استوار کیا

۔۔ ۔ اور ان کے نظام کو ایسا مضبوط بنا دیا کہ وہ عالم کے سردار بنے اور جس جس قوم کی نگرانی و نگہبانی ان کے سپرد ہوئی اس کو انہوں نے پوری طرح عدل و انصاف کی سیاست کے مطابق پورا کیا۔ پہلے ان کے افراد تمدن کے لوازم اور اس کے مقتضیات سے غافل تھے۔ شریعت نبوی اور آیات قرآنی نے انہیں گوناگوں فنون کو طلب کرنے اور ان میں مہارت و وسعت پیدا کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے بقراط و جالینوس کی طب اقلیدس کی جیومیٹری بطلیموس کی ہیئت اور افلاطون اور ارسطو کی منطق اور فلسفہ کو اپنی قومی زبان میں منتقل کیا۔ اسلام سے پہلے وہ ان علوم کا نام تک بھی نہ جانتے تھے۔ تو جس قوم نے دین و مذہب ہی کے سائے میں سیادت حاصل کی ہو اس کی طاقت، قوت اور تہذیب و تمدن کی حفاظت بھی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اصول دین کے ساتھ گہری وابستگی ظاہر کرے۔

بزدلی

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ (تم جہاں بھی رہو گے موت تمہارے پاس پہنچ کر رہے گی۔ خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ ہو)

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ (ان سے کہو کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تم سے مل کر رہے گی)۔

مشاہدہ اور تاریخی واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بعض انسانی

افراد سے ایسے محیر العقول اعمال ظہور پذیر ہوئے ہیں جن کو دیکھ کر انسان کے فہم و فکر کی قوتیں اپنے آپ کو عاجز و درماندہ پاتی ہیں۔ کم سمجھ لوگ ان اعمال کو خارق عادت اور معجزہ سمجھتے ہیں۔ باوجودیکہ نہ تو اُن کا ظہور زمانۂ نبوت میں ہوا۔ اور نہ یہ انبیاء و رُسل کے ذریعے صادر ہوئے۔ کچھ نادان لوگ ان کو افلاک کی حرکتوں، کواکب کی روحوں، اور طبائع کی سازگاریوں سے منسوب کرتے ہیں۔ اور بعض بیوقوف جب ان کے اسباب معلوم کرنے اور حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہ جاتے ہیں تو ان کو اتّفاقات کا درجہ دے دیتے ہیں۔

مگر جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے عقل و ہدایت کی نعمت سے مالا مال کیا ہو وہ جانتا ہے کہ خدائے حکیم و خبیر نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر حادثہ کو ایک سبب اور ہر کام کو ایک عمل کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ اور تمام کائنات میں انسان کو عقل اور روحانی طاقت کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ جن کے ذریعہ وہ عجیب عجیب اعمال صادر کرتا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے اسے احکامِ شریعت کا مکلّف ٹھیرایا گیا ہے انہی کی بنا پر وہ عقلا کی مجمع میں تعریف یا مذمّت کا سزاوار ہوتا ہے اور انہی کی وجہ سے ثواب و عذاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر کوئی صاحب بصیرت صحیح غور و فکر سے کام لے گا تو اسے بنی نوع انسان کی یکسانی اور ہم آہنگی سے یہ یقین آجائیگا کہ ادراکات کے سرچشمے سارے انسانوں میں یکساں ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہر انسان کو کسب کمال کی

استعداد بخشی ہے اور نیک اور بہتر اعمال بروئے کار لانے کے لئے قوائے ذہنیہ وجسمانیہ سے مالامال کیا ہے۔ اس بارے میں افرادِ انسانی کا تفاوت اتنا غیر محسوس ہے کہ اگر اس پر دقیق نظر نہ ڈالی جائے گی تو تفاوت کے اسباب معلوم کرنا تو کجا خود تفاوت بھی نظر نہ آئے گا۔

اگر ہر انسان کی خلقت وطبیعت میں کمال کی فطری استعداد ہے اور فخر کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہونے اور عظیم الشان کارناموں کو عمل میں لاکر ممتاز ہونے کی طرف میلان پایا جاتا ہے اور اگر خداوند کریم کے جودِ مطلق کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی طالب اس کے فضل عام سے بے بہرہ اور محروم واپس نہ کیا جائے۔ بشرطیکہ اس کا عزم سچا اور اس کی جدوجہد مخلصانہ ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کی ایک بڑی اکثریت ادنےٰ مراتب پر قانع ہوکر اس درجۂ کمال کو حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ جس کے لئے عنایت الٰہی نے انہیں بنایا تھا اور جس کے لئے یہ فطری میلان ہر وقت انہیں اُبھار رہا ہے۔ یہ حیرانی اُن لوگوں کے حق میں اور بھی بڑھ جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے عدل پر پختہ ایمان لاتے اور اس کے وعدہ اور وعید پر یقین رکھتے ہیں جو اَبَد تک رہنے والے اعمالِ صالحہ پر ثواب حاصل کرنے کی اُمّید رکھتے ہیں اور عذاب میں مبتلا ہونے کے خوف سے غلط کاریوں کے ارتکاب سے باز رہتے ہیں۔ اور جن کا قیامت اور حشر پر اعتقاد ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس دن ہر ایک کا جائزہ لے کر اسے اپنے نیک وبد اعمال کا

بدلہ دیا جائیگا۔ فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ؕ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (ایک ذرہ برابر نیکی کرنے والا بھی اس کا بدلہ دیکھے گا۔ اور ایک ذرہ برابر برائی کرنے والا بھی اس کا بدلہ دیکھے گا۔) وہ کونسی چیزیں ہیں جو انہیں عمل سے روکتی اور مذلت کے عمیق غار میں دھکیلتی ہیں اگر مسببات کو اسباب کی طرف لوٹا کر حقائق کو اپنے داخلی اور خارجی لوازم کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس بے عملی کے فرعی اسباب خواہ کتنے بھی ہوں، لیکن بنیادی سبب جو تمام نقصانات اور برائیوں کا ذمہ دار ہے۔ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے جبن یا بزدلی۔

بزدلی ہی وُہ خصلت ہے جس نے بڑی بڑی مملکتوں کے شجر اقبال کو گھُن کی طرح کھوکھلا کر کے خاک میں ملا دیا ہے اور ان کے تعلقات اور یکجہتی کے رشتے کو کاٹ کر ان کا شیرازہ منتشر کر ڈالا۔ اس نے شہنشاہوں کے عزائم کو کمزور کر کے ان کی سلطنتوں کو تہ و بالا کیا اور ان کے دلوں میں ضعف پیدا کر کے ان کے بلند محلوں کو زمین کا پیوند بنا دیا۔ بزدلی ہی طلبگاروں پر رحمت کے دروازے بند کرتی اور چلنے والوں کی نظروں سے راہ ہدایت کے نشان مٹاتی ہے۔ اسی کی وجہ سے نفوسِ انسانی ذلت و خواری کے کڑوے گھونٹ حلق سے اُتارنے اور غلامی کے بھاری جوئے کو بلا تکلّف اپنی گردن پر رکھنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بزدلی نفس میں یہ استعداد پیدا کرتی ہے کہ وُہ توہین کو صبر و استقلال سے برداشت کرے اور ذلت کے استقبال کیلئے بزدل عنصر اور تنومند اشخاص کو ذلتوں اور مشکلات

جو جو بوجھ اُٹھانے پر آمادہ کرتی ہے ۔ وہ حقیقت میں ان موہوم مصائب سے زیادہ صبر آزما اور گراں ہوتے ہیں جو شجاعت اور بہادری کے اظہار میں پیش آ سکتے ہیں ۔

بزدلی نفس کو جس شرم و عار کو قبول کرنے کے لئے آمادہ کرتی ہے عالی ہمت افراد اسے قبول کرنا تو کجا اس کے قریب جانے پر بھی موت کو ترجیح دیتے ہیں ۔ بزدل کو ذلتوں کی دشوار گزار گھاٹیاں ہموار اور خواری و بربادی کی حقیر زندگی نعمت اور خوشحالی کی حامل دکھائی دیتی ہے ۔

مَن یَھُن یَسھُلَ الھَوَانُ عَلَیہِ مَالِجُرحٍ بِمَیِّتٍ اِیلاَمٗ

ترجمہ :۔ ذلیل آدمی کیلئے ذلت برداشت کرنا آسان ہے ۔ اس لئے کہ مُردہ کو زخم سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی ۔

یہی نہیں بلکہ وہ ہر وقت موت کی تلخیوں کے گھونٹ پر گھونٹ پیتا رہتا ہے اسے اپنے سامنے دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں ۔ دوست نظروں سے غائب ہو چکے ہوتے ہیں اس کا سانس صرف ٹھنڈی آہیں ہی بھر سکتا ہے اور اس کا احساس صرف کسی مصیبت کا درد محسوس کرنے کے لئے رہ گیا ہے مگر وہ ان سب حالتوں میں خوش رہتا ہے ۔ یہ ہے اس کی زندگی ۔ اس کی ساری پونجی قناعت کرتے کرتے خرچ ہو جاتی ہے مگر وہ اپنے آپ کو کامیاب اور اپنی تمناؤں کو بار آور سمجھتا ہے ۔

بزدلی کیا چیز ہے؟ مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز۔ اور ذہن کو ناخوشگوار محسوس ہونے والے ہر حادثہ کے مقابلہ کرنے سے فرار کی راہ ڈھونڈنا۔ یہ ایک زبردست روحانی بیماری ہے۔ جو اس قوت کو فنا کر دیتی ہے جو وجود کی محافظ اور طبعی زندگی کا ایک اہم رُکن ہے۔ بزدلی کے اسباب تو بیشمار ہیں مگر ان سب کی بنیاد ایک ہے اور وہ ہے موت کا خوف۔ موت ہر زندہ وجود کا مآل اور ہر ذی روح کا آخری انجام ہے۔ اس کا کوئی وقت اور کوئی گھڑی مقرر نہیں۔ زندگی کے آغاز سے لے کر بڑھاپے کی انتہائی سرحد تک ہر لمحے اس کا انتظار رہتا ہے اس کا صحیح وقت صرف خداوند تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (نہ کسی نفس کو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کل کیا حاصل کرے گا اور نہ یہ کہ وہ کس زمین پہ مرے گا)

موت سے اتنا شدید ڈر پیدا کیوں ہوتا ہے جو نفس کو ایسے مہلک مرض میں مبتلا کر دیتا ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ انسان اس حقیقت سے غافل ہے کہ اپنے قوے کو اپنے مالک حقیقی کی خوشنودی و رضا کے لئے صرف کرے تو وہ ایک قابلِ احترام مقام حاصل کر سکتا ہے اور دنیا کی بھلائی اور آخرت کی سعادت کے اس بلندِ مقام پہ پہنچ سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے تیار کیا ہے۔

ہاں یہ انسان کی غفلت ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ شجاعت و جسارت جیسے زندگی کے محافظ کے اسباب کو فنا کے اسباب سمجھنے لگتا ہے۔ نادان یہ خیال کرتا ہے

کہ ہر قدم پر ایک نئی موت اور ہر گام پر ایک نئی بلا منہ کھولے کھڑی ہے۔ اگر وہ اپنے سامنے گزرنے والے انسانی واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالتا اور درجات عالیہ کے طلبگاروں نے جس طرح اپنی تمناؤں کو کامیاب بنایا اور مشکلات کو عبور کیا ہے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرتا تو اسے یہ بات معلوم ہو جاتی کہ اس کے تمام خطرات حرف وہم اور شیطانی وسوسوں کا نتیجہ ہیں لیکن اس پر ایک بے ہوشی کی کیفیت طاری ہے اور اُسے اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکے اور حقیقی عزت سے محروم رکھنے کی ذمہ دار ہے۔

بزدلی ایک جال ہے جو نفوس انسانی کو شکار کرنے اور قوموں کا صفایا کر جانے کے لئے حوادثِ زمانہ نے پھیلا رکھا ہے۔ جس میں شیطان اللہ کے بندوں کو پھانس کر راہِ الٰہی سے روکنے میں کامیاب ہوتا ہے یہی ہر کمینگی اور بُری خصلت کی جڑ ہے کوئی بدبختی نہیں جو بزدلی سے شروع نہ ہوتی ہو کوئی خرابی نہیں جس کے جراثیم اس میں نہ موجود ہوں۔ کوئی کفر نہیں جس کے لئے یہ سبب اور علت کا کام نہ کرتی ہو۔ اسی نے جماعتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اسی نے تعلقات و روابط کی محکم بنیادیں توڑیں اسی نے لشکروں کو شکست دی جھنڈوں کو سرنگوں کیا اور بادشاہو کو جلالت کے بلند آسمان سے گرا کر ذلت کے گڑھے میں ڈال دیا۔ قومی معرکوں میں خائنوں کو خیانت پر اکسانے والی اور پست فطرت لوگوں کو رشوت جیسی ذلیل حرکت کی طرف مائل کرنے والی خصلت یہی بزدلی ہے۔ رشوت ستانی کو بزدلی

کی مثال میں پیش کرنا ذرا بعید معلوم ہو گا لیکن اگر تم غور کرو تو اس بزدلی کے جراثیم کو جھوٹ۔ نفاق اور معیشت انسانی کو بگاڑنے والے باقی تمام امراض کی تہ میں سے تلاش کر کے نکال سکتے ہو۔ بزدلی ننگ ہے۔ عار ہے ہر انسانی فطرت کے لئے عموماً اور ان لوگوں کے لئے خصوصاً جو اللہ، اس کے رسولوں اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے اعمال کے نتیجے اجرِ حسن اور مقام کریم کو حاصل کرنے کے امیدوار ہیں۔

اسلامی اصول کا تقاضا ہے کہ فرزندانِ توحید اس کمینہ خصلت سے دنیا کے دوسرے تمام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ دور رہیں۔ کیونکہ وہ صرف اللہ تعالےٰ کی رضامندی چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے والے اعمال کے بجا لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی بزدلی ہے۔ قرآن کی تلاوت کرنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کی محبت کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے اور اسی کے ذریعہ بغض و عناد رکھنے والوں کے دلوں کا امتحان لیا ہے جو لوگ مومن نہیں ان کی مذمت میں ارشاد ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ، فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔ (کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ (پہلے) ان کو یہ حکم دیا گیا کہ

(جنگ و جدال سے) اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نمازوں کو قائم کرکے زکوٰۃ دو۔ پھر جب ان پر لڑنا فرض کردیا گیا تو اچانک ان کا ایک گروہ لوگوں سے اُسی طرح ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈرنا (چاہیئے) بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم پر لڑائی کیوں فرض کی؟ کیوں ہمیں ایک مقررہ وقت تک کے لئے مؤخر نہ رکھا)

حق کے راستے میں قدم بڑھانا۔ اور حق کا بول بالا کرنے کے لئے مال و جان قربان کرنا مومن بننے کی پہلی علامت ہے۔ کتاب الٰہی نے صرف نماز کو قائم رکھنے زکوٰۃ دینے اور قتل و قتال سے رُکنے کو کافی نہیں سمجھا اور بتایا کہ ان اعمال میں مومن، کافر اور منافق سب شریک ہو سکتے ہیں بلکہ ایمان کی واحد علامت عدل الٰہی کو پھیلانے اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لئے جاں نثاری کو بنیادی رُکن قرار دیا ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد باقی ارکان کسی شمار و قطار میں نہیں رہتے۔ خبردار کبھی یہ خیال مت کرنا کہ اسلام اور بزدلی کا ایک ہی دل میں جمع ہونا ممکن ہے۔ دین کا ہر جزو ہمارے سامنے بہادری اور اقدام کا تصور پیش کرتا ہے اور سارے اسلام کی بنیاد اسی پر قائم ہے کہ محض اللہ کی عبادت اختیار کرکے اس کی رضامندی حاصل کرنے کی خاطر باقی ساری کائنات کی محبت دل سے نکال دو۔

مومن وہی ہے جس کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ موت کا وقت اور تقدیر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ انہیں جس طرح چاہے کام میں لاتا ہے۔ جو یہ جانتا ہو کہ ادائے فرض سے پہلو تہی کرنا موت کے وقت کو مؤخر نہیں کر سکتا

اور نہ پیش قدمی کرنا اس میں سے ایک منٹ کو گھٹا سکتا ہے۔ ہر صورت میں موت ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر وقت مقررہ پر آپہنچتی ہے۔ مومن اپنے نفس کے لئے دو نیکیوں میں سے کسی ایک کا متوقع رہتا ہے۔ یا یہ کہ سرداری اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرے اور یا پھر شہادت کی وہ موت حاصل کرے جس کے ذریعہ رضائے الٰہی کا قرب نصیب ہو۔ سعادت اخروی کی دولت ملے اور روح اعلیٰ علیین میں پہنچ کر ملائکہ مقربین سے جا ملے۔ لہٰذا جو شخص اس وہم میں پڑا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن پر ایمان لاکر بھی وہ اپنے دل میں بزدلی کو جگہ دے سکتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو دھوکے میں ڈال رہا ہے عقل کو فریب میں مبتلا کر رہا ہے۔ اور اپنی ہوس کے بہلاوے میں آرہا ہے۔ درحقیقت اس کے دل میں ایمان کا ایک ذرّہ بھی موجود نہیں۔ قرآن کریم کی ہر آیت گواہی دے رہی ہے کہ بزدل آدمی ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر ہم انبیاؑ کے وارثوں یعنی علمائے کرام سے اُمید کرتے ہیں کہ وہ حق کا بانگ دُہل اعلان کریں اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ذریعہ لوگوں کو نصیحت کریں اور وہ احکام سنائیں جو خداوند تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ کے قدم بڑھانے اور فرائض و واجبات کی بجاآوری میں سستی و تاخیر نہ کرنے کے بارے میں قرآن کریم میں نازل فرمائے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اگر علماء نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس فرض کو تھوڑی مدت تک بھی سرانجام دے

دیا اور قرآن کریم کے معانی کو اچھی طرح واضح کر کے عام لوگوں کو نصیحت کی اور قرآن کریم کی عظمت دلوں میں زندہ کردی - تو ہم اس کا اثر ملّت اسلامیہ میں اتنا پائیدار دیکھیں گے جو ابدالآباد تک یادگار رہے گا اور ہماری زندگی میں ایک دن وہ آئے گا جب امّت اس دنیا میں عطیۂ الٰہی کی بہت بڑی فضیلت یعنی مجد اور بزرگی کی دولت سے سرفراز ہوگی - مومنوں کو اپنے اسلاف سے جو اوصاف ورثہ میں ملے ہیں اور ان کے دلوں میں عقائد کے جو اثرات گھر کر چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے صرف تھوڑی سی تنبیہہ اور ذرا سے اشارے کی ضرورت ہے - پھر وہ شیر کی طرح پھریں گے اپنی کھوئی ہوئی عزت وسعادت کو دوبارہ حاصل کریں گے اور موجودہ عزت وسعادت کی حفاظت کر کے مقامِ محمود کے درجہ پر فائز ہوں گے -

---

شرف

شرف یا عزّت ایسا مقام ہے جو دُنیا کی ہر قوم کو مرغوب ہے۔ ہم میں سے اکثر اس کے معنی کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ بعض اشخاص کے نزدیک عزت کا مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے محل تعمیر ہوں۔ سر بفلک عمارتیں قائم کی جائیں منقش و آراستہ دیواریں ہوں۔ نوکروں چاکروں کی ایک کثیر تعداد خدمت میں بھرتی رہے عُمدہ عُمدہ گھوڑے اصطبل میں بندھے ہوئے ہوں۔ کاریں اور فٹن سواری کے لئے موجود ہوں۔ بعض لوگ عزّت کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ بہترین اور بیش قیمت اور رنگا رنگ کپڑے زیب تن ہوں اور بیش بہا زیور جن میں الماس، یاقوت، زمرّد وغیرہ قیمتی پتھّر جڑے ہوں جسم کو زینت دے رہے ہوں۔ ایک جماعت کا تخیّل عزت کے متعلق یہ ہے کہ مناصب اور خطابات حاصل کر کے بیگ یا پاشا بن جائیں یا اچھے اچھے تمغے حاصل کر کے اپنی شان بڑھائیں۔

عزت کے انہی تصوّرات کی تکمیل کے لئے تمہیں کوئی شخص تو ایسا ملے گا جو اپنے بھائی کے مال کو جبراً چھینتا ہے، اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کی دولت پر حملہ کرتا ہے۔ اپنی قوم اور ہموطنوں کی ملکیت پر غاصبانہ قبضہ کرتا ہے تاکہ حرام کے ذرائع سے حاصل شدہ مال کے ذریعے وُہ اپنا ایک محل تعمیر کرے، ایک عمارت کی بنیادیں

اُونچی کرے، ایک کمرہ کے لئے سامان آرائش مہیا کرے، اپنے لئے چند نوکر پیشہ چوکیدار، غلام اور خادم مقرر کرے۔ ایسے کاموں سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے بڑی بزرگی اور افتخار مل گیا اور اب میں معزز آدمی کہلانے کا مستحق ہوں کوئی اس سے بھی زیادہ بُرے طریقوں سے لوٹ کھسوٹ کرتا ہوا نظر آئے گا۔ اور اس کا مطمح نظر یہ ہو گا کہ بلند اور فاخر لباس پہنے اور نہایت خوبصورت زیور سے آراستہ ہو۔ یا کم از کم اس کے پاس یہ چیزیں اس مقدار میں جمع ہوں جس سے وہ دوسروں کے سامنے اپنی شیخی بگھار سکے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسی طرح مَیں بلندی کے مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں مجھ ایسے لوگوں کی رسائی مشکل ہے۔ وُہ اپنی اس حالت کو عزت سے تعبیر کر کے سمجھتا ہے کہ میں لفظ عزت کے حقیقی معنوں کو سمجھ رہا ہُوں۔ کوئی آدمی سارا دن یہی سوچتا اور تمام رات اسی تصور میں جاگتا ہے کہ کسی طرح اسے کوئی بڑا خطاب۔ یا کوئی تمغہ مل جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ ہر وسیلہ کو استعمال کرتا ہے۔ خواہ اس سے اس کا ملک برباد، اس کی قوم ذلیل، اور ٹکڑے ٹکڑے ہی کیوں نہ ہو جائے کیونکہ اپنے خیال میں تو وہ عزت کی حد تک پہنچ ہی گیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کے افکار پر حقائق کی جگہ اوہام نے قبضہ کر لیا ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ ابھی ان میں حق و صداقت کو دیکھنے کی قوت بالکل ختم نہیں ہوئی اور نہ وہ وہم میں پڑ کر راہِ حق سے مُڑ جانے اور دھوکا کھا جانے کے احساس سے ابھی غافل ہوئے ہیں۔ پھر جو شخص اپنے محلات اور "حور و غلمان" پر

فخر کرتا ہے کیا اُسے یہ احساس نہیں ہوگا کہ اُس کی ذات اِن تمام ساز و سامان سے گراں قدر ہے مگر اِس کی ذات نے کوئی کمال حاصل نہیں کیا۔ کیا اُسے یہ خیال نہیں کہ اُس نے جو کچھ حاصل کیا وہ پھر بھی اس کی ذات سے بالکل الگ ہستی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی نسبت صرف اتنی ہے کہ اس نے اس کے حاصل کرنے میں محنت کافی کی۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ بہت سے لوگ جو اس دوڑ میں اُس سے آگے بھی بڑھ گئے تھے زمانے نے ان کے ہاتھوں سے اُن کی پونجی چھین لی اور وُہ صرف اپنی طبعی صلاحیتوں کے مالک رہ گئے۔ ایسے لوگ اگر کمالِ انسانی کے کسی درجہ میں نہ تھے تو انہیں نچلے طبقوں میں شامل ہونا پڑا، پھر دلوں میں ان کی قدر و منزلت نہ رہی۔

جو شخص اپنے مال اور لباس پر فخر کرتا ہے اگر اسے اس لباس سے علٰحدہ کر کے دیکھا جائے اور اگر اس کی ذات میں فضیلت کا کوئی زیور اور کمال کی کوئی آرائش نہ ہو تو کیا وہ اُن فقیروں کی مانند نہ ہو گا جو لباس تک سے عاری ہیں۔ کیا اُس شخص کو زیور اور لباس پہ فخر کرتے وقت اپنے ضمیر کی یہ آواز نہیں آتی کہ وُہ اپنی ذات پر پردہ ڈال کر اپنی اصلیّت کو چھپانا چاہتا ہے۔ جو شخص اپنے منصب پر مغرور و نازاں ہے اگر وہ اپنے موجودہ منصب تک پہنچنے اور اسباب فخر مہیّا کرنے سے پہلے کسی بڑے مرتبہ اور عظیم الشان ذاتی کمال کا مالک نہیں تھا تو کیا اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ اپنے اس منصب اور اسباب فخر کے چھن جانے کی صورت میں ذلّت کے پُرانے

درجے پر پھر لوٹ سکتا ہے اگر اس وقت بعض سادہ لوحوں کے خیال میں وہ تمغہ کے آویزاں ہونے کی وجہ سے عزّت کا مستحق ہے تو یہ عزّت دراصل اس کی نہیں بلکہ اس تمغے کی ہے۔ ایسی عزّت عارضی اور بہت ناپائیدار ہے۔ یہ ایک ظاہری اور رسمی عزّت ہے جس کا اثر دلوں پر کبھی نہیں ہو سکتا۔

بیشک ان خطابات اور تمغوں کی قدر ہے اور ان سے حوصلے بلند ہوتے ہیں مگر اسی وقت جب کہ ان سے پہلے انسان کے پاس کوئی ایسا کام موجود ہو جس کی گراں قدری کا اعتراف سارا عالم کرتا ہو اور جس کا اس خطاب یا تمغہ سے اظہار ہوتا ہو تاکہ جب بھی یہ خطاب سامنے آئے تو اس کی یاد تازہ ہو جائے لیکن اگر ان خطابات سے پہلے کوئی ایسا کارنامہ موجود نہ ہو اور مرضحہ کارنامے موجود ہوں جنہیں راست باز اور سمجھدار انسان بُرا سمجھتے ہوں تو یہ تمغہ اور خطاب اُس جرم کی نشانی بن جائے گا۔ اور خطاب والے کے اعتبار کو مٹا دے گا۔

دیکھو اور غور کرو غلطی نہ کرنا۔ حق و صداقت تمہارے قریب ہی موجود ہیں۔ عثمان غازی نے اپنی قوم کے تحفظ کے لئے اپنی جان وقف کردی اور اپنے دین کے کلمہ کو بلند و بالا کرنے کے لئے وُہ جدوجہد کی جس کا اعتراف دوست دشمن دونوں کو یکساں طور پر کرنا پڑا۔ دشمنوں نے انہیں شیر بلادنہ کا خطاب دیا۔ اور اپنی حکومت کے بڑے لوگوں کے طبقۂ عالیہ میں انہیں بڑی قدر و منزلت نصیب ہوئی۔ عظیم الشان رتبہ ملا اور بڑے بڑے خطابات سے عزّت افزائی ہوئی اسی طرح ممالکِ اسلامیہ کے بعض نوابوں اور رئیسوں کو برطانیہ کی عظیم الشان حکومت

کی طرف سے بڑے بڑے خطابات عطا ہوئے ہیں۔ کیوں کہ اپنے ممالک کو دشمنوں کے قبضہ میں دینے کے لئے انہوں نے اپنی فوجوں کے آگے آگے رہنمائی کی تھی انہوں نے انگریزوں کو اپنے ملک کا حاکم بننے میں مدد دی یہی وہ لوگ تھے جنکی وجہ سے تمام عالم اسلامی کو آج انگریزوں کو اپنے ممالک سے نکالنے کے ذرائع سوچنے پڑ رہے ہیں۔ کیا عثمان پاشا غازی کے تمغے اور ان فریب خوردہ لوگوں کے سینوں پر لگے ہوئے تمغوں کی قدر یکساں ہو سکتی ہے؟ اگر تم دونوں تمغوں کی قدر پر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ خطابات کا شرف اور قدر خطاب، یا تمغہ پانے والے شخص کی خدمت اور شرافت پر موقوف ہے۔ اگر وہ خدمت ناکارہ ہے تو یہ خطاب یا تمغے بھی کسی کام کے نہیں۔

یہ اوہام کی دُنیا میں رہنے والے کس چیز سے دھوکے میں آگئے۔ کیا وُہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کپڑے جن پر تازہ لہو کے نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں وہی اپنے پہننے والوں کی طرف سے اچھائی کی ختم نہ ہونے والی یاد دلوں میں قائم کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی قوم کے لئے عزت طلب کرتے ہیں وہ اس کی راہ میں جان دے کر سرخروئی حاصل کرتے ہیں۔ انہی کی یاد میں لوگ سوگ مناتے ہیں۔ اور انہی کی فضیلت پر دل شہادت دیتے ہیں۔ کیا اُن کو یہ معلوم نہیں کہ جن لوگوں نے کسی چھینے ہوئے حق کو حاصل کرنے کے لئے گہرے غاروں یا جیل خانوں میں قید ہو کر جانیں دیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی یاد آفتاب کی سی بلندیوں تک پہنچ گئی اور جن کے نام سب ناموں

سے اُونچے رہے۔ جو لوگ اُونچے اُونچے بالاخانوں میں بیٹھ کر اپنے چمن اور باغات کی طرف دیکھا کرتے تھے اور اپنے محلات کے دریچوں سے نظارے کا لطف اُٹھاتے تھے اور جنہوں نے دنیوی امارت سے فائدہ اُٹھانے ہی میں اپنی زندگیاں ختم کر دیں آج ان کی کوئی یاد باقی نہیں اور اپنی زندگی میں بھی اس حیثیت کے علاوہ جو انہوں نے اپنے گھروں میں حاصل کی تھی خارجی دنیا میں ان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ ان لوگوں کی حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ جو چادروں کو زمین پر گھسیٹا کرتے اور ریشم و دیباج پہننے کے عادی تھے۔ یہ لوگ خود بھی گزر گئے اور ان کے ساتھ ان کے لباس بھی ختم ہو گئے۔ وہ جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے اور یہ پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس دنیا میں آئے اور کب چل بسے۔

کیا کبھی یہ سُنا ہے کہ بنی نوع انسان میں سے کسی کی یاد اس لحاظ سے لوگوں کے دلوں میں باقی ہو کہ اُسے فلاں فلاں منصب اور تمغے عطا ہوئے؟ کبھی نہیں۔ ہاں مشہور ہستیوں کا ذکر اس طرح اکثر ہوتا ہے کہ اس نے علم حاصل کیا، خدا کے راستے میں دیا، کافی خرچ کیا۔ کسی کو سرفراز کیا، کسی کو ذلیل کیا، جہاد کیا، دشمنوں سے مقابلہ کیا، کسی کو ہلاک کیا اور کسی کو بخش دیا۔ ایسے اعمال پائیدار نتائج رکھتے ہیں۔ جب سکندرِ اعظم کا ذکر ہوتا ہے تو کیا کسی کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اس کا کوئی محل تھا یا نہیں۔ وہ کون احمق ہو گا جو نپولین کی سیرت کو کسی ایسے محل کے کھنڈروں میں ڈھونڈے گا جہاں اُس کی رہائش تھی یا ان چیتھڑوں میں

تلاش کریگا جنہیں کبھی اُس کے بدن پر رہنے کا شرف حاصل تھا۔ بتاؤ دُنیا کے بڑے لوگوں کو شہرت اور عزّت کا رتبہ بلند عمارتوں کی بنیاد رکھنے، ان میں سامان آرائش کرنے، اور رفاہیت اور تنعّم کی زندگی بسر کرنے پر ملا۔ یا یہ کہ عمارتیں، سامان اور تنعّم کی زندگی کے دوسرے اسباب اس وقت ملے جب انہوں نے طاقت حاصل کر کے کچھ لوگوں کو سیادت سپرد کی اور ملکوں کو فتح کیا۔ کسی ملک پر غلبہ حاصل کیا۔ اور کچھ جماعتوں کو اپنا تابع فرمان بنالیا۔ مگر ایک قوم خواب خرگوش میں پڑ کر دھوکا کھا گئی۔ اس نے اپنے ملک کے حالات کے بارے میں اپنے فرائض بجالانے میں کوتاہی کی اور اس کی عزّت و رفعت کو ان بے معنی ناموں کے بدلے میں بیچ دیا جو خطاب کے طور پر انہیں عطا ہوئے تھے ضمیر کی آواز کے بالکل خلاف انہوں نے اپنے آپ کو یہ تسلّی دی کہ ہم نے عزّت کے مرتبے کی طرف ترقی کی۔ حالانکہ وُہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ منصب اور تمغے اب نااہلوں کو بھی ملنے لگے ہیں کاش وہ اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھرتے اپنے دلی جذبات کی پر زور تنبیہات کو سُنتے اور اپنے گردو پیش پر بھی نظر ڈالتے تو ان پر اچھی طرح واضح ہو جاتا کہ وہ بہت ہی رذیل اور دُور افتادہ درجہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ وُہ سمجھ لیتے کہ انہوں نے عزّت کے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس کو طلب کرنے میں صحیح راستہ بھول گئے ہیں۔ ان کے وطن پر جو مصائب نازل ہوئے اور ان کی اولاد پر جو ذلّت آئی اگر انہیں اس کا احساس ہوتا تو خطابات واپس کر دیتے اور تمغوں کو اتار کر

دُور پھینک دیتے اور حقیقی عزّت کو طلب کرنے کے لئے سامان کے ساتھ یا بے سروسامانی میں جس طرح بھی ہو سکتا چل پڑتے۔

عزّت ایک متعین حقیقت ہے جس کی توضیح شریعت اور مذاہب نے کی ہے۔ جس شخص کو بھی عقل سلیم عنایت ہوئی ہے وُہ اس کے سمجھنے میں شک و شبہ کا شکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جس دل پر مُہر لگی ہو اور آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑ گیا ہو اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔

عزّت انسان کی ایک رونق ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی نگاہ میں جگہ بنا لیتا ہے۔ دل اور ذہن اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس رونق کو چمکانے اور دوبالا کرنے والی چیز، وہ عمل ہے جو عزّت کا طلب گار سرانجام دیتا ہے اور جس میں اس کی قوم اور ہم مذہبوں یا تمام بنی نوع انسان کی بھلائی مضمر ہوتی ہے مثلاً ہلاکت سے بچانا، جہالت اور نادانی کو دُور کرنا، چھینے ہوئے حق کو طلب کرنے پر متنبہ کرنا۔ لوگوں کو کھوئی ہوئی عزّت اور حکومت یاد دلانا، لغزش کے بعد صحیح راہِ عمل کی طرف اُبھارنا۔ غفلت سے بیدار کرنا۔ عام بھلائی کا راستہ دکھانا، کسی بھیانک مصیبت سے ڈرانا۔ اخلاقی تہذیب اور ذہنی تربیت میں امداد دینا، ثقافت اور تمدّن کی اہمیت کو واضح کرنا۔ لوگوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنا، رابطہ کی تجدید کرنا۔ کسی کمزوری کے بعد انہیں قوت پر آمادہ کرنا، ان میں غیرت کا شعلہ روشن کرنا اور حمیّت کی آگ بھڑکانا۔

جو شخص یہ کارہائے نمایاں انجام دیگا جن سے مندرجہ بالا نیکیوں کی تکمیل ہو وہی صاحب عزت ہے چاہے وہ ایک کٹیا اور جھونپڑی میں ہی رہتا ہو، گدڑی اور چیتھڑے پہنتا ہو۔ جنگل کی سبزیاں اس کی خوراک ہوں۔ درویشی کی خاک پر اس کی رات بسر ہوتی ہو، ابھری ہوئی زمین سے تکیہ کا کام لیتا ہو۔ جنگل میں مارا مارا پھرتا ہو اور ٹیلوں اور غاروں کے درمیان اس کی دوڑ دھوپ جاری ہو۔ ایسے شخص کا زیور اس کا کام ہے۔ اس کا کمال اس کی رونق اور اس کی جدوجہد اس کی روشنی ہے جو کھوئی ہوئی عقل اور حیران و متفکر دلوں کو خودبخود اپنی طرف کھینچتی ہے۔ حسّاس طبیعتیں اس کو پہچانتی اور اس کی قدر کرتی ہیں۔ لوگوں کے دل پروانہ وار اس کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کی ہمدردیاں اس سے کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ اس کے بلند اور اونچے محل، شاندار عمارتیں۔ دل کو بہلانے والا جمال اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنی یہ سب اس کی روح میں ہوتی ہیں وہ چھپنے بھی نہیں پاتا کہ پھر سامنے ہو جاتا ہے اور پردے میں جانے نہیں پاتا کہ اسے دیکھ لیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق لوگ بہتر رائے رکھتے ہیں اور ہمیشہ اچھے لفظوں میں اُسے یاد کرتے ہیں، اس کا صالح عمل اُسے اعلیٰ علیّین تک پہنچاتا ہے اور اس کی پاکیزہ زندگی دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی چمکتی ہوئی عزت ہمیشہ زمانہ کی پیشانی پر آب و تاب دکھاتی رہتی ہے۔

وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔ (جو لوگ خوبیوں کے لئے مقابلہ کرتے ہیں ان کا مقابلہ ایسی چیزوں کے لئے ہونا چاہئے)۔

بیشک بعض بد باطن لوگوں کی طرف سے اس پر ظلم و ستم کی کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ اسے زبان کے نیزوں اور ملامت کے تیروں سے زخمی کرتے ہیں۔ اس کے اعمال کے پھول اور شگوفے ان کے فہم اور احساسات کے لیے بہت عجیب معلوم ہوتے ہیں اور ان کی نظروں میں نہیں جچتے وہ صرف ان ہی اخلاق کو عزت اور بزرگی خیال کرتے ہیں جو ناپسندیدہ ہیں اور جن کے بارے میں ہم نے شرائع کی تشریحات اور عقلا کے تبصروں کی روشنی میں بحث کی ہے۔ یہ لوگ انہی اخلاق کو عزت اور بزرگی کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ ساقط رذائل پر ٹوٹ پڑنے کے عادی ہیں۔ موری کے کیڑے کی طرح یہ لوگ گلاب کے پھول کی خوشبو کو ناپسند کرتے ہیں اور گندگی اور بدبوؤں میں خوش رہتے ہیں۔ یہ بات کچھ بعید نہیں کہ بعض اخلاق سے عاری لوگ کسی صاحب فضل و عمل کا مذاق اڑائیں یا کچھ غیر ذمہ دار افراد اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ کریں۔ دراں حالیکہ ایسا کرکے وہ اپنی ہی عادت کا مذاق اڑاتے اور اپنی ہی مصلحتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ مگر اس اندھیرے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی جس وقت ان صاحب عمل لوگوں کے کارنامول کا مرغوب پھل ظاہر ہوگا اس وقت وہ اسے حاصل کرنے کے لئے دوڑے دوڑے آئیں گے اور کسی تامل کے بغیر اس سے اپنی طبیعت کو فرحت بخشنے کی سعی کریں گے اس کے بعد ان کے لئے درخت لگانے اور پھل کی حفاظت کرنے والوں کی تعریف کئے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔ حالانکہ ان دنیوی خرفات میں سے، جس کی قیمت

ایک دانشمند کی نظر میں کچھ بھی نہیں، انہیں بہت ہی کم حصہ ملا ہو گا۔ پھر ان کے ان قصوروں کی سزا یہی ہو گی کہ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہوں گے۔ اپنی برائیوں پر کف افسوس ملیں گے اور اپنی بدسلوکیوں کو یاد اور اپنی غلطی کا احساس کر کر کے ان کے دلوں کا درد بڑھتا رہے گا۔ اسی طرح عنایت الٰہیہ صاحب عزت اور صاحب کردار لوگوں کو ان کی زندگی میں اعزاز عطا کرتی ہے اور جب اس کی زندگی کا آفتاب اس دنیا کے افق سے غروب ہو جاتا ہے تب بھی اس کی روشنی کی کرنیں ختم نہیں ہوتیں اور ستاروں اور چاند کے ذریعہ اپنی روشنی پھیلاتی رہتی ہیں۔ بیشک اس کا جسم عدم کے پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے مگر دلوں میں اس کی یاد اور زبان پر اس کا نام باقی رہتا ہے۔ یہ شہید قوم اپنے پروردگار کے ہاں سے رزق وصول کرتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور اس کی زندگی بہترین زندگی ہے۔

وَلِهٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ ۝ (اگر کسی کو کام کرنا ہو تو ایسے ہی نتائج کے حصول کے لئے کام کرنا مناسب ہے)۔

نیک نامی کی تمنا عالم انسانی عبرت کا مرقع اور بصیرت حاصل کرنے والوں کے لئے ایک بڑا دفتر ہے۔ اس عالم کا ہر زمانہ اس کا ایک صفحہ ہے اور ہر گروہ اس صفحہ کی سطر یا جملہ۔ اس کتاب میں آفریدگار نے جو کچھ لکھا ہے۔ ہمارے لئے اس میں عبرت ہی عبرت ہے۔

اگر ہم اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں سب سے پہلا فائدہ تو یہ حاصل

ہو گا کہ ہمیں مختلف رسموں اور متفرق ادوار اور اقوام کے حالات معلوم ہو جائیں گے کئی قومیں ایسی نظر آئیں گی جنہوں نے ابھر کر ترقی کی۔ عزت کے بلند مدارج پر پرواز کی اور اس حد تک اوپر گئیں کہ نظر کی حدود سے بھی آگے بڑھ گئیں۔ اس کے بعد اُتریں۔ گریں اور ان کے نقوش مٹ گئے اور اس کے بعد دُنیا میں ان کے کارناموں کا کوئی نقش باقی نہیں رہا۔ صرف کہانیوں اور تاریخ کے افسانوں میں ان کا نام باقی رہ گیا۔ کئی قومیں ایسی بھی نظر آئیں گی جو پہلے کائنات کی شاہراہ پر عدم کے پردے میں لپٹی پڑی تھیں پھر انہوں نے وجود کا زیور زیب تن کیا اور اجتماعی حیثیت سے بلند ترین مقام حاصل کیا۔ اس کے بعد فنا و زوال کی لازوال فوجوں نے ان پر حملہ کیا اور انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کچھ قومیں ایسی بھی نظر آئیں گی جو آج تک عزت کی خلعت میں ملبوس ہو کر طاقت کے بلند مدارج پر قابض ہیں اور دنیا والوں کو ان بلند مدارج سے ان کے احکام اور پیغام پہنچتے رہتے ہیں۔

بعض لوگ تو ایسے ہیں جن پر یہ حالات اور یہ مناظر اسی طرح منکشف ہوتے ہیں جس طرح تصویریں کسی کے سامنے آتی ہیں کہ کچھ چیزیں جو انہیں پسند آتی ہیں ان پر وہ خوشی کے مارے پھول جاتے ہیں اور کچھ چیزیں جو بُری معلوم ہوتی ہیں۔ ان پر ان کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے۔ لیکن ان حالات کے ظہور کی اصل منشا اور ان میں انقلاب آجانے کے اسباب سے وہ بالکل غافل ہوتے ہیں اگر ان سے پوچھا جائے کہ ان انقلابات کی وجہ کیا ہے تو یہی جواب ہو گا کہ اللہ

تعالیٰ کی مرضی ہے ۔ زمانے کا یہی حال رہا ہے اور یہی رہیگا۔ بخت کی کارستانیاں ہیں جس کی قسمت کھوٹی نکل جائے وہ مصائب اور حوادث کا شکار ہو جاتا ہے۔

مگر کچھ صاحب بصیرت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی عمیق نظر حقیقت کی تہ تک پہنچ جاتی ہے اور وُہ ان اسباب پر عبور حاصل کر لیتے ہیں۔ جو قوموں کے عروج و ترقی اور تنزل و پستی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں ۔ ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی قوم کو کچھ بھلائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے تو اس کا ذریعہ وہ باہمت افراد ہوتے ہیں جنہوں نے کوشش اور جد وجہد کی زندگی بسر کی اور بسا اوقات اپنا جان اور مال قربان کر کے اپنی قوم اور ہم جنسوں کیلئے عزّت کی عمارت کھڑی کرنے میں کامیاب ہوئے وہ ان سربلند محبوبوں کے نام کی شہرت، دلوں میں ان کے قابل ستائش وقعت اور عام لوگوں کے مقابلے میں ان کے قابل عزت امتیاز کی حقیقت کو صاف طور پر محسوس کر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ جسمانی اعتبار سے عام لوگوں سے کچھ ممتاز نہ تھے، ان کے بدن میں جو خون دوڑ رہا تھا۔ وہ کیمیاوی اجزا کے لحاظ سے دوسرے لوگوں کے خون سے مختلف نہ تھا۔ یہ لوگ صرف اپنی بلند ہمتی کی وجہ سے دوسروں سے آگے بڑھے ۔ ان لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرتے ہوئے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے بعض اور لوگ بھی تعریف اور بقائے دوام سے متمتع ہونے کے لئے کبھی کبھی ان کے راستہ پر چلنے لگتے ہیں۔ پھر جب ان میں سے کوئی شخص ان کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور ان کے طریق کار پر مضبوطی سے جم جاتا ہے تو ابھی اس نے چند ہی قدم اُٹھائے ہوتے ہیں اور ابھی اس کی نظروں سے ابتدائے سفر کا مقام بھی اوجھل نہیں ہونے پاتا کہ اس

کے قدم پھسل جاتے ہیں اور اُسے اپنے سامنے کٹے ہوئے ہاتھ، کٹے ہوئے سر، بریدہ اعضاء، بکھرے ہوئے بال اور روندے ہوئے سینے نظر آتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو حق کے طلبگار اور قومی خدمت کے میدان کے شہسوار تھے مراتب عالی کے طلب گار کو وہ راستہ جس پر چل کر وہ اس مرتبہ کو پہنچے بہت ناہموار اور پرخطر معلوم ہوتا ہے۔ جہاں سے جنگلوں اور گھاٹیوں کے وحشت ناک مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اور شیروں کے دہاڑنے اور چیتوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں صاف سُنائی دیتی ہیں۔

ان مناظر کو دیکھ کر کبھی تو اس کا ارادہ سُست اور اس کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ وُہ اپنے راستے پر اُلٹے پاؤں لوٹنا شروع کر دیتا ہے اور جس مقام سے چلا تھا اُسی کی طرف دوبارہ پہنچ کر ایک بدترین حالت کو پسند کر لیتا ہے اور اپنی اصل منزل سے عدم پر پہنچکر ختم اور گمنام ہو جاتا ہے۔ مگر کبھی اُسے الہامِ الٰہی کی طرف سے یہ اشارہ مل جاتا ہے۔ کہ قدرت ایک فرد کی ذات سے، قوموں کی تشکیل اور بنی نوعِ انسان سے اچھے اور نیک اعمال کا مطالبہ کرتی ہے جنہیں پُورا کرنے کے لیے نفس کو کوشش کے ساتھ آمادہ کرنا پڑتا ہے اور ریاضت کے دباؤ سے نفس کی سرکشی کو ختم کرنا پڑتا ہے اور اجتہاد کے خلاف نفس پر ریاضت کے دباؤ، ہولناک اور تباہی پھیلانے والے حوادث کا مقابلہ کرنا ضروری ہے ہمت جب کسی چیز کی اچھائی کی طرف انسان کو اُبھارتی ہے تو اس کی امداد

کے لئے وُہ بلند قوتِ ارادی ہی کافی ہے جو خداوند تعالیٰ نے ہر انسان کی طبیعت میں ودیعت کر رکھی ہے۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے صحیح معنوں میں انسانی زندگی مرحمت فرمائی ہے وہ مشکلات کے ہجوم کے وقت جدوجہد کے معاملے میں اور زیادہ حریص ہو جاتا ہے اور مقابلہ اور مناظرہ کے وقت اپنے مخالف پر غالب آنے اور اُسے مطمئن کرنے میں اور زیادہ زور دکھلاتا ہے لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کی صورت تو انسانوں کی سی ہے مگر وہ اپنی زندگی دوسرے جانوروں کی طرح گزارتے ہیں ایسے لوگوں کی حیوانی زندگی میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ ان مشکلات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں جن کا سامنا انسان کو انسانی فضائل بروے کار لانے میں کرنا پڑتا ہے۔

بیشک پہاڑ پر چڑھنے والے کو تکان کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن آخرکار چوٹی پر پہنچ کر آرام بھی وہی حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے بلند مقام کی پناہ میں حملہ آور کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو اعلیٰ مراتب کے حصول کے لئے صحیح اور نیک جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص پستی کی طرف مائل ہوتا ہے اسے زندگی میں ختم نہ ہونے والے خطرات کی دولت ہی ملتی ہے جو اسے ہر وقت کسی شکاری کے شکار میں پھنسنے اور کسی درندے کا لقمہ بن جانے کا خوف دلاتے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ شہرت کی طلب میں مرے لیکن اُسے حاصل نہ کر سکے۔ مانا کہ بہت سے طلب کرنے والے اپنی اُمیدوں کی انتہا تک پہنچ بھی چکے ہیں مگر ان

لوگوں کی تعداد ان سے کئی گنا زیادہ ہے جو اچانک ہلاکت کا شکار ہوئے اور یہ وہی لوگ تھے جو گمنامی سے مانوس ہو کر حیوانی زندگی پر قانع ہو گئے یہ باتیں سچائی کی آوازیں ہیں۔ یہ روح کے پاکیزہ جھونکے ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ عقل کی نعمت عطا کرے اور تائید اس کے شاملِ حال ہو وہ ان کے ذریعہ بہترین مقاصد حاصل کرنے پر آمادہ ہو گا یہاں تک کہ یا تو اپنے مقصد تک پہنچ جائے یا موت کا پیالہ باعزّت طور پر نوشِ جان کر لے۔

کوئی قوم علوم و معارف، اخلاق و فضائل، عدل کے قوانین، مضبوط دفاع وغیرہ میں سے کوئی فضیلت حاصل کر کے اس وقت تک تعریف کی مستحق نہیں بن سکتی جب تک اس کے بعض افراد ان مہموں کو سر کرنے کے لئے نہیں نکلتے جن سے عام لوگ ڈرتے ہیں اور جن سے ان کے دلوں پر ہیبت طاری ہوتی ہے ایسے ہی لوگ مشکل راہوں پر چلے اور اپنی قوموں کو ان انتہائی مقامات تک پہنچایا۔ جہاں تک ان کی ہمتیں ان کا ساتھ دے سکتی تھیں اور اس ساری جدوجہد میں ان کا بھروسہ صرف خداوند تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی پر تھا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فطری قانون ہے کہ انسانی ارادہ کسی عمل کے لئے اسی وقت حرکت میں آتا ہے جب انسان نے کسی ایسے مقصد کا تصور کر لیا ہو جس سے اس کی ذات کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔ اور جب اُسے یہ یقین یا غالب گمان ہو کہ وہ اس عمل سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔

جو لوگ کسی قوم یا بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے مشقت اٹھاتے اور ان مشکل کارناموں میں زندگی صرف کرتے ہیں جن کا نفع ان تمام افراد کو یکساں پہنچتا ہو جو ان کے ساتھ قومیت، مذہب یا انسانیت میں شریک ہیں انہیں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں روحانی تکالیف پر غالب آتے آتے اور طرح طرح کی سختیاں برداشت کرتے کرتے ہی گزر جاتی ہیں - اور خود ان کے بھائی اور ہم قوم رفقا ان کے مقاصد میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں - انہیں لعنت و ملامت اور سب دشتم کا نشانہ بناتے ہیں اور وہ لوگ بھی ان کے خلاف پوری طرح صف آرا ہوتے ہیں جنہیں ان کی جد و جہد کے کامیاب ہو جانے کی صورت میں اتنا ہی فائدہ پہنچے گا جتنا ان کے دشمن کو پہنچتا ہے - تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان لوگوں کے پیش نظر کسی لذت کو حاصل کرنے یا کسی دکھ سے پناہ ڈھونڈنے کی خواہش نہیں تو پھر قوم کی خدمت کرنے اور اتنی تکلیفیں اٹھانے سے ان کا منشا کیا ہوتا ہے وہ کون سا جذبہ ہے جو ان کی خواہشات پر غالب آجاتا ہے اور انہیں اتنی ہمّت عطا کر دیتا ہے کہ مصائب کی کوئی صعوبت ان میں کمزوری نہیں پیدا کر سکتی ؟

اس سوال کا جواب موجود ہے - اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں ایک جذبہ ودیعت کیا ہے جو سب جذبات سے زیادہ قوی ہے اور انسان جن خواص کے ذریعہ باقی انواع سے ممتاز ہے ان میں سب سے زیادہ اہم یہی جذبہ ہے - یعنی "سچّی تعریف اور سچائی کے طریقوں سے شہرت حاصل کرنے کی محبت" ان الفاظ پر غور کیجئے - میں

نے صرف تعریف کی محبت کا نام نہیں لیا کیونکہ مطلق تعریف جسے سچ اور جھوٹ کا امتیاز مدّنظر رکھے بغیر دھوکے اور ریا کے ذریعے حاصل کیا جائے اور جس کے لئے شیطان جیسا ضمیر رکھنے کے باوجود شرفا کا ظاہری لباس پہن لیا جائے۔ میرے نزدیک کسی شمار و قطار میں نہیں، کیونکہ ایسی تعریف کی محبّت یا خواہش اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب فطرت بیمار اور مسخ ہو کر اپنی طبعی رفتار چھوڑ دے۔ لہٰذا میری مراد سچّی تعریف سے ہے جو روحانی غذا اور نفسانی علاج ہے۔ اور ایک لازوال دولت ہے۔ جتنا بھی کوئی شخص کمالِ انسانی کے قریب جائیگا اور شہوات و خواہشات کی حقیر اور سطحی لذّتوں کو بے کار سمجھے گا۔ لازوال تعریف کی محبّت کا جذبہ اس میں زور پکڑتا جائے گا۔ اور وُہ ان بلند ترین کارناموں کو سرانجام دینے کی کوشش کریگا جن سے ایسی لازوال تعریف حاصل ہو سکے۔ ذرا غور فرمایئے تو معلوم ہو جائے گا کہ صاحبِ فضیلت انسان کی زندگی اس عالم میں دو حصّوں میں منقسم ہے۔ ایک چھوٹی اور محدود زندگی جو اس کے یومِ پیدائش سے لے کر عمر کی مقرّرہ انتہا تک ہوتی ہے۔ دوسری طویل اور لاانتہا زندگی جس کی ابتدا اُس تاریخ سے ہوتی ہے جب اس کا کوئی پسندیدہ عمل کسی فائدہ پر منتج ہو اور اپنی قوم یا بنی نوع انسان کے کام میں آئے۔ اس موخرالذکر زندگی کی انتہا اسی وقت ہوتی ہے جب اس کا اثر لوگوں کے ذہن اور تاریخ کے صفحات سے مٹ جائے۔ مختصر یہ کہ صاحبِ فضیلت انسان کی رُوح کے دو وجود ہیں، ایک وُہ

جو خاص اس کے بدن سے ہی ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو عزت و احترام کی شکل میں ہر انسان کے دل میں موجود رہتا ہے۔ اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہ لمبی اور کارآمد ترین زندگی اس چھوٹی اور بیکار زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اور دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کم قیمت چیز کو بہترین چیز کے لئے قربان کر دیا جائے۔

جس اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کو کمال تک پہنچنے کے ذرائع عطا کئے ہیں۔ اسی نے فطرت انسانی میں اپنی تعریف سُننے کا جذبہ بھی ودیعت کیا ہے اور یہ چیز بھی انسان کے ذہن میں بٹھائی ہے کہ وہ حق اپنے حقدار کو پہنچا دیا کریں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ہر قوم کی زبان اُسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان رہتی ہے جو اس کے لئے رفعت و بزرگی اور فضیلت و کمال تک پہنچنے یا کسی علم اور صنعت میں آگے بڑھنے کا سبب بن چکا ہو۔ ایسے شخص کی تصویریں گھر گھر آویزاں کی جاتی ہیں اور تاریخ کے اوراق اس کی تعریف سے پُر کئے جاتے ہیں۔ اس کے مجسّمے بنائے جاتے ہیں اور اس کے پسندیدہ سوانح کو یاد کر کے سینہ بسینہ اپنی اولادیں پھیلاتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک یہ قوم خود ختم نہ ہو جائے یا دنیا ختم ہو جائے۔

مگر جس وقت کوئی قوم اپنے کسی خادم کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیتی ہے یا اس کے کارناموں کو سراہنے میں بخل کرتی ہے تو ہمتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ مصلحت عامہ کے لئے جدوجہد سُست ہو جاتی ہے۔ قومی خدمت کے لئے

عمریں وقف کرنے یا رضا کارانہ زندگی پیش کرنے میں لوگ تامل کرنے لگتے ہیں۔ قوم کی حالت ابتر ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے کٹ کر فنا ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر حادثہ کو ایک سبب کے ساتھ وابستہ کیا ہے اور اس کے قانون کا تقاضا یہ ہے کہ جب کسی قوم میں نیک و بد، خبیث و طیب، فضیلت و ذلت، مصلحت اور فساد کی قدر یکساں ہونے لگے۔ وہ اپنی قوتِ تمیز کو ختم کرکے اپنے خادموں کے کارناموں کی قدر کما حقہٗ نہ کرے، اسے کوئی قابلِ ستائش کام اچھا معلوم ہو اور نہ بُرا کام بُرا، تو ایسے وقت میں قوم کے افراد سے بلندی کے درجات اور کمالات حاصل کرنے کا جذبہ چھین لیا جاتا ہے اور قوم کے لئے یہ مصیبت ظالموں کے ظلم اور غلبہ حاصل کرنے والوں کے غلبہ سے زیادہ دردناک ہوتی ہے مگر جب قوم کے جمہور احسان کا اعتراف اور فضیلت کی تعریف کرنے والے ہوں تو پھر وقتاً فوقتاً قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اس اعتراف اور تعریف میں قوم کو مصائب سے نجات دلانے کے لئے میدان میں آگے آجاتے ہیں لیکن جب یہ احساس ختم ہو جاتا ہے تو اس کا علاج اسی طرح مشکل ہو جاتا ہے جس طرح بڑھاپے کی بیماری کا انجام موت اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

سچی تعریف سے موصوف ہونا انسانی زندگی کے لئے ایک بڑی نعمت ہے جبکہ اس نعمت کے حصول کے لئے بنی نوع انسان کے بہترین افراد جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ نعمت خود بخود عطا فرمائی ہے چنانچہ فرمایا

وَرَفَعنَا لَكَ ذِكرَكَ (ہم نے تمہارے ذکر کو بلند کیا)

اس جذبہ کی سچائی اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ طبیعت کا تقاضا بھی یہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے سچی تعریف کے مستحق لوگوں کو یہ اجازت دی ہے کہ تحدّث بالنعم کے طور پر اپنے اعمال صالحہ کا قصہ بیان کر دیا کرو۔ چنانچہ اپنے نبیؐ کو یہ اجازت دی یا حکم فرمایا کہ وَاَمَّا بِنِعمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّث (اپنے رب کی نعمت کا تذکرہ کیا کرو)

قوموں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ بات واضح طور پر معلوم ہو گی کہ جب کبھی کسی قوم نے بلند کارناموں کی قدردانی کم کی اور آپس میں فضیلت کی حیثیت کو کم سمجھا، اس کی بقا کے اسباب کم ہو گئے۔ ایسی قوموں کی بنا مٹ جاتی ہے اور گزرے ہوئے دن کی طرح ان کا نشان تک صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جاتا ہے۔ یہ مسلّمہ کلیہ ہے کہ ناشکری اور نعمتوں کا زوال آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔

اگر ہم اپنا مضمون اس پاک جماعت کی شکرگزاری پر ختم کریں۔ جس نے ان نامساعد اور اوقات میں بھی خطرہ کے عمیق غار کے منہ پر کھڑے ہو کر پیش قدمی کی اور جس نے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی سعی کرنا اپنا واحد نصب العین قرار دیا ہے۔ تو کچھ بے جا نہ ہو گا۔ یہ بات بھی ہمارے لئے بڑی عزّت افزا ہے کہ اس جماعت کے افراد روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے اعمال کی کامیابی اور ان کے مقاصد کی تائید کے لئے دعا کرتے ہیں بیشک وہی بہتر کارساز اور بہترین مددگار ہے۔

فضائل و رذائل

وَاذْكُرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ("نصیحت کی باتیں سُنایا کرو کیونکہ نصیحت مومنوں کو فائدہ دیتی ہے")

عقلا کہتے ہیں کہ انسان کے لئے کمال تک پہنچنے اور نقصان سے بچنے کی کوشش کرنا فرض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ جتنے فضائل کو حاصل کرنا اس کے لئے ممکن ہو انہیں سمیٹ لے اور نقصان یہ ہے کہ رذائل میں سے کسی ذلّت میں ملوث ہو جائے۔ فضائل اور رذائل کی تشریح کیا ہے؟

فضائل نفس کی وہ خصلتیں ہیں جو انسان کے درمیان اُلفت اور اتفاق کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ مثلاً سخاوت، عفّت اور حیا وغیرہ۔ دو سخی آدمی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بخل سے پیش نہیں آئیں گے۔ اور اس لئے انہیں کاروبار اور معاملات میں ایک دوسرے سے نزاع کا موقع بھی پیش نہیں آئے گا۔ کیونکہ ہر ایک کی خصلت یہ ہے کہ حق کے راستے میں خرچ کرتا اور حق کے تقاضا کے طور پر خرچ سے ہاتھ روکتا ہے۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کو اپنی سرحد معلوم ہے۔ اور وہ اُس سے آگے نہیں بڑھتا۔ چنانچہ جب یہ لوگ آپس میں معاملہ کرتے ہیں تو ان کے درمیان نزاع پیدا ہونے کے لئے کوئی موضوع ہی نہیں ہوتا

اسی طرح عفیف لوگ کسی قابلِ اشتہا چیز پر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی خصلت یہ ہے کہ شہوات اور خواہشات سے دُور رہے اور ان مرغوبات میں دوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دے۔ الغرض علمائے تہذیب نے جن جن اخلاق کو فضیلت کے اوصاف میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے ایک ایک پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ ہر خصلت کا خاصّہ ہے کہ جن لوگوں میں وہ پیدا ہو جاتی ہے وہ اُس حد تک آپس کے جھگڑے اور نزاع سے بچ جاتے ہیں اور ان میں اُلفت قائم ہو جاتی ہے، اس طرح اگر کسی شخص میں یہ سارے یا اکثر فضائل جمع ہو جائیں تو اس کا میلان تمام یا بیشتر مقاصد میں اتحاد و اتفاق کی طرف ہی ہو گا اور اگر یہ فضائل اس کی طبیعت میں جتنا گہرا اثر کر چکے ہوں گے اسی قدر یہ اتحاد بھی زیادہ پائیدار ہو گا۔ اگر یہی فضائل دو شخصوں کی بجائے کسی جماعت میں پیدا ہو جائیں تو پوری جماعت میں یہی اوصاف پیدا ہو جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ فضائل افراد کے درمیان اتّحاد پیدا کرنے اور ہیئت اجتماعیہ کو یگانگی سے ہم کنار کرنے کا واحد ذریعہ ہیں۔ فرد ہو یا جماعت فضائل ہر ایک کو اپنے ہم جنس کے قریب پہنچاتے ہیں اور اس طرح جمہور عوام ایک شخص واحد کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں کہ ایک ہی ارادہ کے تحت حرکت میں آتے ہیں اور ایک ہی مقصد کی طرف چلتے ہیں۔

فضائل کے مجموعہ کا نام عدل ہے۔ ہر ایک کام میں عدل کسی گروہ میں جب عدل پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا ہر فرد عمل میں اپنی اپنی حد پر قائم رہتا ہے اور دوسروں کے حقوق میں دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتا اور اس طرح اس گروہ کے افراد میں

مساوات اور یکجہتی پیدا ہوجاتی ہے

ہرانسان کا ایک مخصوص وجودِ انفرادی ہے۔ جس کی اپنی حفاظت کرنے کے لئے اور نوعِ انسانی کی بقا کی خاطر نسل بڑھانے کے لئے اُسی میں مخصوص قوّتیں بھی ودیعت کی گئی ہیں۔ ان قوّتوں میں وہ باقی حیوانات کے ہم پلّہ ہے۔ مگر حکمتِ خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان، ترقّی یافتہ اور بلند پایہ زندگی کے ذریعہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ یہ اس کا اجتماعی وجود ہے۔ جس میں ایک ہی خیال کے بیشمار افراد سے ایک جسم یا مجموعہ بنتا ہے۔ اور یہ جسم یا مجموعہ ایک نام سے مخصوص کیا جاتا ہے۔ اس کے وجود میں افراد اعضا کا کام دیتے ہیں۔ اور مختلف شکلوں میں مختلف فرائض بجالاتے ہیں۔ ہر فرد جسم اجتماعی کی بقا اس کی تقویّت اور اس کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے کوشاں رہتا ہے اسلئے کہ جسم اجتماعی کے مجموعی فائدے اور ترقّی سے اسے بھی نفع پہنچے گا۔ بعینہٖ اس طرح جس طرح اعضا جسم کے اعمال و وظائف میں مشغول ہوتے ہیں اور جسم کی قوّت کا فائدہ ان کو بھی پہنچتا ہے۔

اِس وجودِ اجتماعی میں فضائل کو وہی حیثیت حاصل ہے جو وجودِ انفرادی میں قوتِ حیات کو ہے۔ قوتِ حیات ہر عضو کو وہی طاقت بخشتی ہے۔ جس سے وہ اپنا کام کرنے پر قادر ہو اور اپنی سرحد سے آگے تجاوز نہ کرنے پائے۔ مثلاً ہاتھ کا کام کسی چیز کو پکڑنا اور زور لگانا ہے اُس کے اعمال میں دیکھنا شامل نہیں

اس کے برخلاف آنکھ کا کام دیکھنا اور رنگوں اور شکلوں میں تمیز کرنا ہے پکڑنا اور زور لگانا نہیں مگر یہ دونوں اعضا ایک ہی طرح زندہ ہیں۔ بہ الفاظ دیگر فضائل کی حیثیت عالمِ انسانی میں وہی ہے جو فضائے عالم میں کشش کی ہے۔ جس طرح ستاروں اور سیاروں کا نظام ایک عام کشش کے ذریعہ قائم ہے کہ کشش کے توازن سے ہر ایک ستارہ اپنی جگہ پر لٹکا ہوا ہے اس کے اور دوسرے ستاروں کے درمیان نسبت محفوظ ہے اور خدائے غالب و دانا کے مقرر کئے ہوئے اندازے کے مطابق وہ اپنے خاص مدار میں ایک منظم رفتار کا حامل ہے۔ اسی طرح اجتماعِ انسانی میں فضائل کی حیثیت ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالٰے وجودِ شخصی کو بھی مقررہ اجل تک محفوظ کر لیتا ہے اور نوعِ انسانی کو قیامِ قیامت تک ثابت و برقرار رکھتا ہے۔

دُنیا میں کوئی قوم ایسی بتا سکتے ہو جس میں عہدہ داروں کو معزول کرنے یا منصبوں پر فائز کرنے کے اختیارات رکھنے والے حراست و پاسبانی اور نظم و ضبط کرنے کا فرض انجام دینے والے محاصل کو جمع کرنے اور مصائب سے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے والے اور ان کے سارے امور کو چلانے والے اور ضروریات کا اہتمام کرنے والے قوم ہی کے افراد ہوں خواہ وہ طبقۂ علیا سے تعلق رکھتے ہوں یا طبقۂ متوسط سے یا عوام الناس میں سے ہوں اور پھر ان منصب داروں میں بھی ہر شخص قومی حقوق کا محافظ ہو، قوم کے مقاصد قومی امور اور اجتماعی مصلحتوں

کے خلاف کسی اور مصلحت کی طرف مائل نہ ہو۔ قومی امور میں سے کسی امر کا اہتمام کئے بغیر نہ چھوڑے اور اس طرح یہ ساری جماعت ایک مضبوط عمارت کا نمونہ پیش کرتی ہو کہ جسے نہ آندھیاں ہلا سکیں اور نہ زلزلے لرزا سکیں۔ ان سب کی انفرادی طاقتوں سے قوم کی اجتماعی طاقت کو تقویت پہنچے جس سے وہ اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے شرف اور بزرگی کی حمایت کر سکے اور اغیار کے حملوں اور یورشوں کا جواب دے سکے؟ اگر کوئی قوم ایسی موجود ہے تو وہ وہی قوم ہو گی جس میں فضائل کا دَور دورہ ہو اور مکارم اخلاق کی بلند پائیگی مسلّم ہو چکی ہو۔ ایسی قوم کے افراد ایک دوسرے سے اختلاف بھی کریں گے تو اُلفت بڑھانے کے خیال سے، ایک دوسرے سے غیریّت کا اظہار بھی کریں گے تو اتّفاق و اتّحاد کی خاطر ایک دوسرے کے مخالف عمل اختیار کرنے میں ان کی مثال اُن دو چکّر لگانے والوں کی طرح ہو گی جو ایک دائرہ کا چکّر لگانے کے لئے ایک ہی نقطہ سے دو مخالف سمتوں میں چل پڑیں مگر دراصل وہ ایک دوسرے نقطہ پر ملنے کے لئے روانہ ہوئے ہوں اپنے منافع کو حاصل کرنے کے لئے ان کے طریق کار کے مختلف ہونے کی مثال ایسی ہے کہ دو شخصوں نے کسی رسّی کے دونوں سروں کو پکڑ لیا ہو اور ایک دوسرے کو کھینچنے کی کوشش کرتے ہوں، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے دُور ہٹنے کی کوشش بھی کر رہا ہے مگر اس کو اپنی طرف لانے میں بھی مشغول ہے۔ اس طرح یہ دونوں

اشخاص ایک دوسرے سے جُدا اور مختلف نہیں اور ان میں سے کوئی شخص اپنے مفاد کے لئے دوسرے کے نفع کو ختم نہیں کرتا - ایسی قوم کے افراد کو خداوند کریم کی طرف سے اتفاق واتحاد کی جو نعمت عطا ہوئی ہے اس کی وجہ سے اس کے مختلف راستے قومی زندگی اور قومی عظمت کے ایک ہی مرکز پر جاکر ختم ہوتے ہیں - یہ قوم اپنے فوائد کو حاصل کرنے اور اپنے منافع کا پُورا پُورا خیال رکھنے میں ان دریاؤں کی طرح ہے جو سمندر کو پانی دیتے ہیں جس کا پانی دوبارہ بادلوں کے ذریعے انہی میں آکر جمع ہو جاتا ہے -

اس قوم کا ہر فرد یہ سمجھے گا کہ درجات کی رفعت، غلبہ، عزّ وجاہ کی وسعت اور حکومت جیسی خوبیاں جن سے نفوسِ انسانی کو خوشی اور سرور حاصل ہوتا ہے اور جن کی رغبت اور خواہش رکھنے میں انسان دیگر حیوانات سے ممتاز ہے - اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب ساری قوم کے پاس ان کا پُورا پُورا ذخیرہ موجود ہو - اس لئے ہر ایک کی یہ کوشش ہو گی کہ قوم کے ہر فرد کو اُس انتہائی سرحد تک پہنچا دے جہاں تک پہنچنے کی اس میں صلاحیّت موجود ہے اور اس طرح اس کی کمائی میں خود بھی شریک ہو سکے - اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد وُہ قوم کی ہیئتِ اجتماعی تو کیا کسی فردِ مخصوص کی حفاظت واعانت میں بھی خیانت اور غفلت سے کام نہ لے گا - کیونکہ یہ خیانت دراصل اپنی ذات کے ساتھ ہو گی - اس طرح وُہ اپنے کام کے ایک آلے کو توڑتا ہے اور اپنے مقصد

کے ایک سبب کو بیکار بناتا ہے۔ وہ کسی فرد کی تحقیر نہ کرے گا اور کسی کے عمل کو خفیف نہیں قرار دے گا۔ وہ قوم کے چھوٹے سے چھوٹے فرد کو اُس مینخ کی طرح سمجھے گا جو کسی بڑے اوزار میں لگی ہو اور جس کے ٹوٹنے سے سارے اوزار کے بیکار ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

ذیل میں ہم چند اخلاقِ فاضلہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمارے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں بغور دیکھو کہ ان سے کون سے نتائج و آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔

تدبّر، غور و فکر، اوہام پرستی سے آزادی، عفّت، سخاوت، قناعت، نرمی، وقار، تواضع، علو ہمّت، صبر، حلم، شجاعت، ایثار، دوسروں کے فائدہ کو اپنے اُوپر ترجیح دینا، بہادری، سماج کا احترام، سچّائی، وفا، امانت، حسد اور کینہ سے گریز، عفو، رفق، مروّت، حمیّت، حُبِ عدالت، شفقت۔

اگر یہ عظیم الشان اوصاف کسی قوم کے ہر فرد میں یا کم از کم اکثر افراد میں پائے جائیں تو کیا ان میں کامل اتحاد اور یگانگت کے سوا دوسری چیز پیدا ہو سکتی ہے کیا ایسے دو رفیقوں میں جن میں سے ہر ایک عاقل، آزاد، صادق، وفادار، کریم بہادر، رفاقت کا دلدادہ، صابر، حلیم، متواضع، صاحب وقار، پاکباز اور مہربان ہو۔ مخالفت اور نفرت پھیلنے کا کوئی بہانہ ہو سکتا ہے۔ خدا کی قسم اگر ان فضائل کی ہواؤں کا ایک جھونکا کسی قوم کی بنجر زمین پر پہنچ جائے تو اُسے ہرا بھرا کر دے۔

چٹیل میدان کو سبزہ زار بنا دے اور قحط زدہ زمین پر رحمت کی اتنی بارش برسا دے کہ قوم اللہ تعالیٰ کی نعمت سے مالا مال ہو جائے اور اسے وحدت کا وہ لباس عطا کرے جو کبھی تار تار نہ ہو۔ اور تحفظ اور امن کا ایسا مضبوط قلعہ مہیّا کر دے جو کبھی نہ توڑا جا سکے۔

اِن اخلاقِ فاضلہ میں کمال تک پہنچنے کا سب سے زیادہ حق اس قوم کو پہنچتا ہے جس کے نبیؐ کا ارشاد ہے کہ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (مجھے تو اخلاق فاضلہ کو مکمّل بنانے کے لئے بھیجا گیا ہے) فضیلت قوموں کی زندگی ہے جو ان کے اجسام کو اجنبی عناصر کی مداخلت سے محفوظ رکھتی ہے اور زوال و انتشار سے بچاتی ہے۔ وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُهْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (اگر قصبات کے باشندے صلاح پر پابند ہوں تو تمہارا رب اُنہیں ہلاک نہیں کرے گا)

رذائل وہ خبیث کیفیتیں ہیں جو انسانوں کو عارض ہو کر ان کے اتّفاق کو زائل اور ان کی وحدت کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ ان کی مختصر فہرست یہ ہے:

بے شرمی، کسی کی آبرو پر حملہ کرنے کے لئے سوقیانہ طریقہ استعمال کرنا سقامت، حماقت، طیش، تہوّر، بزدلی، کمینگی، گھبراہٹ، حسد، کینہ، تکبّر، شیخی، فتنہ پردازی، استہزا، غدر، خیانت، جھوٹ اور نفاق۔

ان میں سے جو وصف بھی ود افراد کے نفس میں موجود ہو گا۔ ان میں لازمی طور پر دشمنی اور عداوت پھیلے گی اور بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ جائے گی کہ پھر اتّفاق کی

اُمید کوئی نہ رہے گی کیونکہ ان میں سے بعض اوصاف کا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان دُوسروں کے حقوق پر دست اندازی کرنے میں حد سے تجاوز کرتا ہے اور بعض کا اثر یہ پڑتا ہے کہ انسان خود اس حد تک گِر جاتا ہے کہ ان حقوق میں سے کسی حق کو بھی ادا نہیں کر سکتا جو اس پر اپنے ہم جنس، ہم مذہب، ہم قبیلہ، ہم خاندان یا کسی دیگر رفیق کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ حالانکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہر اُس شخص سے نفرت کرتا ہے۔ جو اس کے حقوق پر حملہ کرے یا اس کے کسی حق کو ادا کرنے سے قاصر رہے۔ ذرا ایسے دو شخصوں کا تصور کرو جو یکساں طور پر بے حیا، فحش گو، بدمعاش، بزدل، لالچی، حاسد، کینہ ور، جھگڑالو، خائن، بے وفا، جھوٹے، منافق، بخیل، متکبر، ایک دوسرے کے حقوق کا احترام نہ کرنے اور صرف اپنی تعریف کے پُل باندھنے والے ہوں۔ کیا وہ کسی مقصد کے لئے کبھی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ کیا ان میں سے ہر ایک وصف ایک کو دوسرے سے الگ اور بیزار رکھنے کے لئے کافی نہیں۔

یہ رذائل جب کسی قوم میں پھیل جاتے ہیں تو اس کی عمارت کو توڑ کر اس کے ارکان کو پراگندہ اور منتشر کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد انسان کے اجتماعی وجود کا طبعی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس قوم پر کوئی اجنبی طاقت حملہ کرے، اسے جبراً اپنا تابع فرمان بنائے اور زندگی کے کاروبار میں مشغول کر دے کیونکہ معاشی ضروریات اجتماعی زندگی کے بغیر پوری نہیں ہوتیں اور اجتماعی زندگی ان اوصاف

کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے۔ اجتماعی شکل کو کسی حد تک برقرار رکھنے کے لئے خارجی طاقت کا دخل اندازہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

یہ اوصاف جب کسی قوم میں راسخ ہو جائیں تو ان کی شوکت و طاقت کا اظہار آپس ہی میں زیادہ ہوتا ہے۔ بہ ظاہر وہ ایک قوم ہوتی ہے مگر اس کے افراد کے دل ایک دوسرے سے بالکل بیزار ہوتے ہیں۔ ان کی عزت اور غلبہ کا مظاہرہ ایک دوسرے پر ہی ہوتا ہے۔ اجنبی کے سامنے وہ سب ذلیل اور عاجز ہوتے ہیں۔ اپنے اُوپر حکومت کرنے کے لئے وہ دشمنوں کو بلاتے ہیں اور ان کی طرف منسوب ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ غالب قوموں کے لئے وہ راستے ہموار کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں عذاب میں مبتلا ہونے کا موقع خود بہم پہنچاتے ہیں اور ان کے پنجوں کو اپنے اوپر خود ہی طاقتور بناتے ہیں۔ ان کو اپنے ابنائے جنس کا ہر اچھا فعل قبیح نظر آتا ہے اور اجنبیوں کا ہر حقیر کام بڑا دکھائی دیتا ہے۔ جو بات ان کے بچے بچے کی زبان پر ہوتی ہے اگر وہی بات کسی اجنبی کی زبانی سُن لیں تو اُسے حکمت کا بیش قیمت موتی سمجھتے ہیں اور اگر خود ان کا کوئی ذہن وجود کے سمندر میں غوطہ لگا کر حقائق کے موتی نکال لائے اور اسرار و رموز کا انکشاف کرے تو وہ انہیں بیکار ٹھیکرے معلوم ہوتے ہیں اور اپنی زبانِ حال یا زبانِ قال سے کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہماری قوم میں کسی عارف کا پیدا ہونا اور کسی صاحب حکمت کا پایا جانا محال اور ناممکنات میں سے ہے۔ جھوٹے

فخر اور شیخیوں کا زور ان پر غالب ہوتا ہے اور وہ بہت حقیر اور کمینہ مقاصد کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریبان رہتے ہیں۔ خیر خواہوں کی نصیحت کتنے ہی دلائل وبراہین سے سچی کیوں نہ معلوم ہو ان کی نظروں میں مشکوک ہوتی ہے اور واعظان کی بھلائی چاہنے میں مخلص سے مخلص تر کیوں نہ ہوں ان کے مذاق کا تختہ مشق بنتے ہیں جو آدمی ان کی سربلندی اور اتحاد کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اُس کی مساعی کو ناکام کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں اور اس کی لغزش کے اسباب مہیا کرتے ہیں۔ ایسی قوم کے اخلاق باہم متصادم اور عادات واطوار ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔ ایک فالج زدہ جسم کی حرکت غیر منظم ہوتی ہے اور جس طرح کسی خاص مقصد کے لئے اس کے کسی عضو کو معیّن طریقے سے ہلایا نہیں جاسکتا اسی طرح ان کے اعمال واشغال ضبط اور ہم آہنگی کے قانون سے خارج ہوتے ہیں۔ ان اخلاق کی وجہ سے ان کی طبیعتیں فاسد ہو کر ضرر کا منبع بن جاتی ہیں ان میں سے ہر ایک فرد دیوانے کتے کی طرح اجنبیوں سے پہلے اپنے دوست کو کاٹ کھانے کے لئے دوڑتا ہے۔ ایک جنونی آدمی کی طرح وہ سب سے پہلے اس شخص کو قتل کرتا ہے جو اس کی تربیت دینے اور تہذیب سکھانے میں مصروف ہو۔ اس کے بعد طبیب اور تیماردار کی باری آتی ہے۔ اس قوم کے افراد جذام اور آکلہ جیسی مہلک بیماریوں کی طرح پہلے قوم کے چہرے اور ہیئت کو مسخ کر دیتے ہیں اور پھر اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ایسی قوم ہمیشہ کمینگی اور رذالت میں مبتلا رہتی ہے۔ خست اس کے

باقی اوصاف پر غالب ہوتی ہے اس کے افراد اپنے ہم جنسوں پر تو سانس پھلا پھلا کر شیروں کی طرح غراتے ہیں لیکن اجنبی سردار تو کیا کمترین افراد کے سامنے بزدلی دکھانے پر آمادہ کرتے ہیں اور ان میں دشمن سے دب جانے کی عادت ڈالتے ہیں۔ بالآخر قوم ساری کی ساری ختم ہو جاتی ہے اس کی شکل مسخ ہو جاتی ہے اور وہ کسی اور ملت میں مدغم ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے اور حکومتوں کی تبدیلی اور قوموں کی فنا اسی قانون کے تابع ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔ ہمیں اللہ اس انجام سے پناہ دے اور ہماری قوم کو اس عذاب سے بچائے رکھے۔

اب ہمیں ان اسباب پر ایک نظر ڈالنی ہے جو فضائل کو حاصل کرنے اور رذائل سے نفوس کو نجات دلانے اجتماعات بشری کو اتحاد کی راہ پر لانے اور ان کے وجود کو فساد سے بچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں کُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ کے بموجب ہر انسان بحالتِ طفولیت ایک ایسا مادہ ہوتا ہے جو ہر شکل کو قبول کرتا اور ہر رنگ میں رنگا جا سکتا ہے۔ پھر کیا فضیلت اسے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملتی ہے؟ مگر ان کی پرورش بھی تو اسی طرح ہوئی ہے۔ جس طرح ان کی اولاد کی ہو گی۔ پھر ان کے پاس فضائل کا خزانہ کہاں سے آیا؟ حق کی تلاش کرتے کرتے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اصول اخلاق میں اعتدال، فضائل کے زیور

سے آراستگی اور ان فضائل پر عمل کرنے کے لئے اعضاء اور قوتوں کی ریاضت صرف دین ہی کے ذریعے مکمل ہو سکتی ہے اور دین کو ماننے والوں کے دلوں میں اس کا پورا پورا اثر اُتارنے، دین کی بتائی ہوئی ہدایات پر کاربند ہو کر پاکیزہ اور پسندیدہ طرزِ حیات سے فائدہ اُٹھانے کے اُصول ذہن نشین کرانے کا کام اسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب دین کے سردار اس کے عالم اور محافظ اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے اُٹھیں اس کے اوامر و نواہی کھول کر بتائیں۔ اس کی ضرورت کو ذہن نشین کریں۔ لوگوں کو دین پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیں۔ جو لوگ دین کی رعایت سے غافل ہیں انہیں متنبہ کریں اور جو لوگ، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے سے پہلو تہی کر رہے ہیں انہیں پند و نصیحت کریں۔ مگر جب دین کے خادم ہی اپنے فرائض سے غافل ہو جائیں اور اس کے اعمال کی ادائیگی میں بے پروائی دکھلائیں تو عوام میں یقین کمزور ہو جاتا ہے اور وہ دینی عقائد کی طرف سے غفلت اختیار کر لیتے ہیں۔ غفلت کی وجہ سے بصیرتیں تاریک ہو جاتی ہیں۔ حیوانی خواہشات کا زور غالب ہو جاتا اور معاشی ضروریات کا تسلّط بڑھ جاتا ہے۔ اختیار کے ترازو میں شہوات کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے اور نفوس پر رذائل پے در پے مسلّط ہو جاتے ہیں۔ اس وقت عام مخلوق پر عذاب خداوندی لازم ہو جاتا ہے اور اِن پر وہ بدبختی طاری ہو جاتی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

ہر قوم کی بربادی کے اسباب یہی ہیں انسانی وجود کی ابتدا سے لے کر آج

تک بیشمار قوموں میں اُن کے نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض قوموں کا بچا کھچا حصہ اس وقت بھی موجود ہے جو شہادت دے رہا ہے کہ کس طرح رذائل کی وجہ سے پہلے ان کی حالت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور اس کے بعد ان کی قومی ہستی تباہ ہو گئی۔ اس کی مثال ہندوستان کے اطراف میں (منگ) دھیرو قوم ہے جو یورپین اقوام میں "باریا" جماعت کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ قُلْ سِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (آپ ان سے فرمائیں کہ زمین میں سیاحت کے طور پر پھر کر دیکھو کہ تم سے پہلے جو لوگ تھے اُن کا انجام کیا ہُوا) خلاصہ یہ کہ دین جس طرح آخرت میں سعادت کی راہ دکھاتا ہے اسی طرح دنیا میں بھی سعادت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی کئی جماعتوں پر زمانہ کا دور پلٹ گیا ہے۔ ان کی عزت اور تاج ان سے چھن کر دوسری قوموں کے سروں کی زینت بن گئے ہیں۔ آج زمانہ کچھ اور جماعتوں سے بھی وہی کھیل کھیل رہا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس میں بھی وہ مغلوب نہیں رہے گا۔ ایسا کیوں ہُوا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں کوئی نہ کوئی کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ اور قولِ خداوندی اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

کے مطابق یہ کمزوری صرف اسی وجہ سے ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کے اوامر و نواہی

کے اتباع میں غفلت اور سستی پیدا ہو گئی ہے۔ شاید اس بات کی تردید نہیں کی جا سکتی ... کہ بہت سے مسلمانوں کے عقائد تو ٹھیک ہیں لیکن اعمال میں وہ شریعت اسلامیہ کے راستوں پر نہیں چلتے اور یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی قوم کو فضائل و اعمال کی شاہراہ سے جس قدر بعد پیدا ہو گا۔ اُسی قدر اس کی طاقت میں کمزوری پیدا ہو گی۔ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (اور جو کچھ مصیبت تمہیں پہنچی وہ تمہارے اپنے کمائے ہوئے اعمال کی وجہ سے پہنچی)

ہاں مسلمان ابھی تک انہی اصولوں پر قائم ہیں جو انہیں اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملے ہیں۔ ان کو اپنی شریعت کی بتلائی ہوئی وحی پر اعتقاد ہے۔ وہ کتاب اللہ کو بھی پڑھتے ہیں اپنے نبی کی سنّت کا روایت و درایت دونوں طرح سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں سے خاص خاص لوگوں کے نفوس پر تو خلفاء راشدین اور سلف صالح کی سیرتوں کے واقعات بھی منقوش ہیں لہٰذا ان میں سے بعض لوگوں کو شریعت کی پیروی سے غفلت برتنے کی جو عادت ہو چکی ہے اور اس کی وجہ سے ان کی قوّت میں جو ضعف پیدا ہو چکا ہے وہ بالکل عارضی اور غیر دوامی ہے۔

قرآن کریم کی آیتوں میں بہترین فضائل اور اخلاقِ شریفہ کی تفصیل موجود ہے اور مسلمان بھی اپنی اس کتاب کے احترام اور تعظیم کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں۔ اگر علماءِ اسلام اپنا فرض بجا لانے میں مستعدی دکھائیں اور وارثِ انبیاء ہونے کے حقوق کو ادا کریں اللہ تعالیٰ کا خطاب وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ

بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے۔ معروف کا حکم دے اور ناکارہ کاموں سے روکے) اسی طرح فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (پھر کیوں نہ چلا ہر فرقہ میں سے ایک گروہ کہ دین کو اچھی طرح سمجھیں اور جب اپنی قوم کے پاس واپس آئیں تو ان کو ڈرائیں شاید وہ بچنے لگیں) ہر اس شخص سے متعلق ہے جس میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ ہر عالم سے تبلیغ کا مطالبہ کرتا ہے اگر علماء ان آیتوں کے مقتضا کے مطابق عمل کریں، عوام کو قرآن کی باتیں بتائیں اور ان اخلاق محمودہ اور پسندیدہ اعمال کی طرف توجہ دلائیں جن پر صاحب شریعت صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کاربند تھے۔ تو بلا شبہ قوم پستی کے گڑھے سے نکل سکتی ہے اپنی پرانی شان و شوکت کو لوٹانے اور اپنے وجود کو اغیار کے تسلّط، کمزوری اور فتنہ سے بچانے کے لئے سارے افراد ایک دوسرے کی امداد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور یہ سب کچھ بہت ہی قلیل وقت میں ہو جائے گا ایک ہی پکار اور ایک ہی آواز کافی ہو گی اور اسی آواز سے مُردہ اجسام میں جان پڑ جائے گی۔

اسلام کے ہوشمند عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے موجودہ مصائب اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان کے طور پر ہیں۔ وہ امتحان جو بلا وجہ نہیں بلکہ اس پاداش میں ہوا کہ انہوں نے اپنے فرائض سرانجام دینے میں کوتاہی کی۔ اب مسلم عوام

کو علماء کی ہمت، دینی غیرت اور قومی حمیت سے یہ اُمید رکھنی چاہیئے کہ وہ زوال کی گھڑی آنے سے پہلے شگاف کو جوڑنے اور بیماری کی جڑیں مضبوط کرنے سے پہلے اس کے ازالہ کی طرف توجہ مبذول کریں گے۔ فرزندانِ اسلام کو احکامِ خداوندی سنائیں گے ان میں برادری اور اُلفت کے روابط کو اسی طرح مضبوط کرنے کی کوشش کریں گے۔ جس طرح قرآن و سنّت کا منشا ہے اور بعض مسلمانوں کے دلوں میں جو نا اُمیدی پھیل گئی ہے اسے مٹانے کے لئے جانفشانی سے محنت کریں گے اور ان کو سمجھائیں گے کہ خدا کے لُطف و کرم سے نا امید وہی ہوتا ہے۔ جس کا دل بیمار اور عقیدہ خراب ہو ان کو ایسا راستہ بتائیں گے جس پر چلنے سے ان کی آواز ایک، اور ان کا مقصد ایک ہو جائے۔ ظلم سے ان کا انکار قوی اور ذلّت سے اُن کی نفرت مضبوط ہو جائے۔ اور ان میں غیرت کی وہ رُوح سرایت کر جائے جس کے بعد کوئی بھی دین میں خلل ڈالنے والے گناہوں کے ارتکاب پر آمادہ نہ ہو۔ علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ عامۂ مؤمنین کو اس آیت کا مطلب سمجھا کر وعدۂ الٰہی کی حقیقت اور اس کی سچائی ذہن نشین کرائیں۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

ایمان والوں کی امداد ہم نے اپنے اُوپر لازم کی ہے

مُسلمانوں کا تنزّل و جمود

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (اللہ تعالیٰ کی رسّی کو سب مضبوط پکڑو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو)۔

مسلمان اپنے مذہب میں بڑے پکّے، ایمان میں بڑے مضبوط اور یقین میں بڑے ثابت قدم ہیں۔ یہ چیز دوسری قوموں کے مقابلہ میں ان کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے قوی ترین ذریعہ ان کا عقیدہ ہی ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی بتائی ہوئی وحی پر ایمان لانا دنیا اور آخرت کی سعادتوں کا ذمہ دار ہے اور جو شخص ایمان سے محروم ہے وہ ان دونوں سعادتوں سے محروم رہتا ہے۔ انہیں کسی مسلمان کی موت پر اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا اس کے بے دین ہونے پر ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف اُن کے علما کی نہیں بلکہ عوام کی بھی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی شخص خواہ وہ عالم ہو یا جاہل کرۂ ارض کے کسی حصّہ پر یہ سُنے کہ کسی خطّہ یا کسی نسل کا مسلمان کہلانے والا آدمی اپنے دین سے برگشتہ ہو گیا ہے تو وہ تڑپ اُٹھے گا۔ وہ یہ سمجھے گا کہ یہ مُرتد ہونے والا بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا بلکہ اسے وہ سارے

عالمِ اسلامی کے لئے ایک بڑا صدمہ خیال کرے گا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر کوئی مسلمان ایسا واقعہ تاریخ کی کسی کتاب میں سینکڑوں سال کے بعد پڑھ لیتا ہے تب بھی اس کا دل بیقرار ہو جاتا ہے اور غصہ سے خون کھولنے لگتا ہے اور اپنے اس مطالعہ کی حکایت اتنے تعجّب سے شروع کرتا ہے گویا کوئی بڑا نادر واقعہ یا بہت ہی عجیب حکایت بیان کر رہا ہے۔ یہ حرکات اس سے بے اختیار صادر ہوتی ہیں جن کا روکنا اس کی قدرت سے باہر ہے۔

شریعت اور مذہبی قوانین صاف بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں سے خداوند کریم کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کریں جو ممالک ان کے قبضہ و تصرّف میں شامل ہیں۔ یہ مطالبہ سب سے ہے۔ قریب یا بعید، متحد النسل یا مختلف النسل ہونے سے اس مطالبہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ فرض سب پر حتمی طور سے عائد ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے حلقہ کی حفاظت نہیں کرے گی تو اس کا گناہ سب پر آئے گا کیونکہ ان پر یہ فرض ہے کہ قوم کی حمایت اور سلطنت کے تحفظ کے لئے جان و مال خرچ کر دیں۔ ہر قسم کی مشکلات کا مقابلہ کریں اور بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑیں۔ ان کے لئے دوسرے مسلمانوں کے بدلے میں اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے ان اجنبیوں کے ساتھ مصالحت کرنا کسی طرح جائز نہیں جو ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ شریعت نے مسلمانوں کی سیادت اور بزرگی کا مطالبہ اس شدومد سے کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اجنبی تسلّط سے گلو خلاصی کرنے میں عاجز ہو گیا ہو اور اپنے مخالفین

کا حاکم رہنے کے بجائے ان کا محکوم بن گیا ہو تو اس سرزمین کو جواب اس کا وطن نہیں رہی بلکہ دار الحرب (لڑائی کا گھر) ہے چھوڑ کر ہجرت کر جائے - یہ شریعت اسلامیہ کے محکم قوانین ہیں - اہلِ حق ان کو جانتے ہیں اور خواہشات کے بندے جو ہر زمانے میں پیدا ہوا ہی کرتے ہیں ان کو کتنا بھی بدلنا چاہیں تو نہیں بدل سکتے -

مسلمانوں کے دلوں میں جو حق کی غیبی آواز (ہاتف) باقی ہے وہ ہر مسلمان کو وقتاً فوقتاً شریعت کے مطالبات یاد دلاتی اور ایمان کے فرائض کی تلقین کرتی رہتی ہے مگر اس کے باوجود ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج اسلام کے نام لیوا ایک دوسرے پر نازل ہونے والے مصائب سے بے خبر ہیں اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک نہیں ہوتے - چنانچہ بلوچستان والے انگریزوں کی حرکتوں کو صاف دیکھ رہے ہیں لیکن ان کے دل میں اپنے بھائیوں کی امداد کے لئے کوئی جوش و خروش پیدا نہیں ہوتا - بلادِ فارس میں جب انگریز مداخلت کر رہا تھا تھا تو افغانی اس کا مشاہدہ کر رہے تھے لیکن وہ بھی نہ بیقرار ہوئے نہ تلملاتے - آج انگریزی عساکر سرزمین مصر کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پامال کر رہے ہیں اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے لیکن مصریوں کے بھائی خون کے اس سیلاب کو دیکھ رہے ہیں اور ان میں کسی قسم کی شجاعت یا حمیت پیدا نہیں ہوتی -

بڑے تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ ایک طرف مسلمان اپنے دل میں جذبۂ حق کے احساس کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان پر جمود و خمود کا

یہ عالم طاری ہے مگر کوئی واقعہ سبب سے خالی نہیں ہوتا اس جمود و خمود کا بھی ایک سبب ہے۔ جسے ہم اجمالاً بیان کریں گے عقلی افکار، دینی عقائد دیگر معلومات و تصورات اور دلی جذبات ہی اگرچہ پہلے پہل عمل پر آمادہ کرتے ہیں اور ان ہی کے زیر اثر خدا کے حکم سے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ مگر دوسری طرف اعمال بھی بجائے خود دلوں میں ان عقائد و ادراکات کا نقش جماتے اور انہیں مستحکم کرکے ملکہ اور عادتِ ثانیہ کے درجے تک پہنچاتے ہیں اور عقیدہ کے مناسب نتائج اس درجہ تک پہنچنے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔

بے شک انسان کے کمال کا دار و مدار اس کی فکر اور عقل پر ہے۔ لیکن اس عقل کے آئینہ پر مشاہدات اور معلومات کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر مشاہدہ سے ایک فکر کی بنیاد پڑتی ہے اور ہر فکر ایک جذبہ پیدا کرنے میں حصہ لیتا ہے پھر عمل کا اثر ازسرِ نو فکر کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اعمال و افکار کے باہمی تاثیر و تاثر کا یہ سلسلہ جب تک روح اور جسم کا تعلق قائم ہے جاری رہتا ہے اور ایک سے دوسرے کو قوت پہنچتی ہے

از روئے قیاس اخوت اور دیگر نسبی رشتوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے لیکن انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی میں اس کا وجود صرف اس لئے ہے کہ ضرورتوں اور مجبوریوں کا لامتناہی سلسلہ رشتہ داروں اور خاندانوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ فوائد کو حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لئے ایک دوسرے کی امداد کریں۔ یہ امداد کچھ مدت گزر جانے کے بعد دل میں رشتہ کی اہمیت کو راسخ کر دیتی ہے اور پھر تا زندگی انسان رشتہ کی حفاظت کے لئے مستعد رہتا ہے۔ تب نفس کہ جس طرح بھوک، پیاس

اور سیرابی کو طبعی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح رشتہ دار پر آئی ہوئی مصیبت اور ظلم کے وقت دلی ہمدردی اور اس کی امداد کی ضرورت کو بھی طبعی طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کی یہ کیفیت پہلے پہل محض ضرورت کی پیداوار تھی۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ فلاں کے ساتھ میری رشتہ داری ہے مگر اس کے بعد وہ اس تعلق سے بے اعتنائی برتے اور کسی وقت بھی زندگی کی ضروریات اسے اس تعلق کو مضبوط کرنے پر آمادہ نہ کریں۔ یا کسی رشتہ دار کو غیروں میں کوئی امداد کرنے والا مل جائے یا کسی مجبوری کی بنا پر وہ رشتہ داروں کو چھوڑ کر دوسروں کے ساتھ تعلق پیدا کرلے تو اس نسبی رشتہ کا سارا اثر ختم ہو جائے گا۔ اور رشتہ داری کے متعلق اس کے دماغ میں صرف ایک تصور باقی رہ جائے گا۔ جس کا عملاً کوئی وجود نہ ہوگا۔ ایسا تصور جیسا کتابی نقلوں اور تاریخی واقعات کا باقی رہتا ہے۔ ہم انسانی مخلوق میں ربط پیدا کرنے والے ذرائع میں نسبی رشتہ سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ جو حال اس کا ہے وہی اس سے کم درجہ کے باقی روابط و تعلقات کا بھی ہے۔ اجتماع انسانی کے تعلقات پر اثر انداز ہونے والے یہ عوامل جب تک صرف فکر و ذہن تک محدود ہیں اور جب تک مجبوری یا بے پناہ جذبہ کی کشش انسان کے اعضا کو ایسے کاموں پر آمادہ نہ کرے۔ جس سے ان کی عادت راسخ اور پختہ ہو جائے اور اس بار بار کے تجربہ اور مشق سے یہ عادت ثانیہ بن کر انسانی روح کا ایک جزو بن جائے۔ یہ عوامل بے نتیجہ و بے مصرف رہیں گے۔ ذہن میں ان کا ایک قیاسی یا تصوراتی نقش تو ضرور ہوگا جو حافظہ پر زور ڈالنے سے ان کی یاد کو تازہ کر دے گا

لیکن عملی اور حقیقی وجود ان کا کہیں نہ ہوگا۔

ان تین اصولوں کو سوچنے اور ایک فلسفی کی نظر سے ان پر غور کرنے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو چکی ہوگی کہ مسلمان دین کے معاملے میں اتنی پختگی ظاہر کرنے کے بعد کیوں اس حد تک جمود میں پھنس گئے ہیں اور اپنے عقائد میں ساری دُنیا سے زیادہ ثابت قدمی دکھانے کے بعد اپنے بھائیوں کی امداد سے پیچھے کیوں ہٹ جاتے ہیں۔ دراصل عام طور پر مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے والا کوئی مشترک اُصول باقی نہیں رہا۔ ایک دینی عقیدہ ہے۔ مُسلمانوں کا باہمی تعارف منقطع ہو گیا ہے اور انہوں نے ایک دوسرے سے نہایت غیر مستحسن طور پر مفارقت اختیار کر لی ہے۔ لوگوں کے رہنما اور محافظ علماء ہیں مگر ان میں آپس میں کوئی پیام سلام تک نہیں۔ ترکی عالم، حجازی عالم کے حالات سے بے خبر ہے ہندوستانی عالم کو افغانی عالم کے حالات کا پتہ نہیں۔ خود ایک وطن کے علماء کو دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور ان کو مجتمع کرنے کے لئے دوستی، رشتہ داری وغیرہ کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں حالانکہ یہ ذرائع تو عوام میں بھی پائے جا سکتے ہیں علماء کی تنظیم میں نہ کوئی وحدت ہے اور نہ لگاؤ۔ ہر ایک اپنی ہستی کے عالم میں ایسا گم ہے کہ اُسے اِدھر اُدھر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔

جس طرح علماء میں یہ انتشار وافتراق پایا جاتا ہے اسی طرح مسلمان بادشاہوں کا بھی حال ہے۔ کیا یہ بات قابلِ تعجب نہیں کہ عثمانیوں کی سفارت مراکش میں اور

مراکش کی عثمانیوں کے ہاں نہ ہو گیا اس بات سے حیرت نہیں ہوتی کہ دولتِ عثمانیہ جیسی مرکزی سلطنت کے افغانوں اور مشرق کی دوسری مسلمان جماعتوں کے ساتھ کسی قسم کے صحیح تعلقات نہ ہوں۔

ایک دوسرے سے یہ بے رُخی تعلّقات کا یہ انقطاع اور ایک دوسرے سے یہ بیگانگی مسلمانوں میں اتنی عام ہو چکی ہے کہ یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مختلف اقوام اور ان کے شہروں میں باہم کوئی علاقہ نہیں۔ اگر کچھ ہے تو اس امر کا خفیف سا احساس کہ کچھ لوگ اور ہیں جو ہمارے ہم مذہب ہیں اور ہم جیسا اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی اتفاقاً حج کے موقع پر اسے اپنے ان بھائیوں سے مل کر ان کے ممالک کا نام بھی معلوم ہو جائے۔ اس خفیف سے احساس کی بدولت یہ نتیجہ تو نکل آتا ہے کہ جب کسی مسلمان کا حق ضائع ہوتا ہے تو اسے بڑا دکھ ہوتا ہے مگر یہ اثر اتنا کمزور ہوتا ہے کہ اسے بھائی کی امداد کے لئے اُٹھ کھڑا ہونے پر کبھی آمادہ نہیں کرتا۔

ملّتِ اسلامیہ کے تعلّقات میں اس انحطاط کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب خلافت کے رُتبہ سے علم کا رُتبہ الگ ہو گیا۔ اور عباسی خلفاء نے خلافت کے نام پر قناعت کر کے خلفائے راشدین کا طریق کا ترک کر دیا اور دین کی فقہ اور اس کے اصول و فروع میں اجتہاد کرنے علمی ترقّی کے وسائل جمع کرنے سے قاصر رہے۔ اس طرح مذاہب کی تعداد بڑھ گئی اور تیسری صدی ہجری کی ابتدا سے

اتنا تشتت اور اختلاف پھیلا جس کی نظیر دنیا کے کسی مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اختلاف مذاہب کے ساتھ خلافت کی وحدت بھی کٹ کر تین حصوں میں تقسیم ہو گئی بغداد میں عباسیوں کی خلافت قائم تھی مصر اور مغربِ اقصیٰ میں فاطمیوں کی اور اندلس میں امویوں کی۔ اس طرح امت میں افتراق پیدا ہو گیا۔ اور خلافت کا درجہ انحطاط پذیر ہو کر ملوکیت کی سطح پر آ گیا۔ لوگوں کے دلوں سے اس کا رُعب اُٹھ گیا اور ملک و سلطنت کے طلبگاروں نے اس کے حقوق اور رعایت کو بالائے طاق رکھ کر صرف طاقت کے بل بوتے پر حکومت حاصل کرنے کے رنگ ڈھنگ اختیار کرلئے۔

اختلافات اور بڑھ گئے اور آپس کے تنازعات نے ان تعلقات کو اور بھی کاٹ دیا۔ چنگیز خاں اور تیمور لنگ اور ان کے جانشینوں نے غالب ہو کر مسلمانوں کو اتنا تباہ اور ذلیل کیا ان کی توجہ اپنی طرف سے بھی ہٹ گئی اجتماعی روابط بالکل ختم ہو گئے اور علماء اور سلاطین کا رہا سہا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ ہر ایک نے اپنی راہ لی اور اپنے ماحول میں مصروف ہو گیا۔ اس طرح جماعت افراد میں بٹ گئی اور کئی فرقے بن گئے۔ ہر فرقہ ایک خاص داعی اور رہنما کی پیروی کرنے لگا۔ ان میں سے کئی رہنما سیاسی تھے اور کئی مذہبی۔ اس طرح ان عقائد کے اثرات کمزور پڑ گئے جو اتحاد کے داعی اور تعلقات کو مضبوط کرنے والے تھے۔ جو عقائد عقول و افکار میں راسخ تھے ان کی حیثیت صرف صورِ ذہنیہ کی رہ گئی جو خیال کے خزانوں میں محفوظ

ہیں اور صرف کبھی کبھی حافظہ کی گرفت میں آتے ہیں۔ اس کے آثار اب صرف یہ رہ گئے ہیں کہ جب کچھ مسلمانوں پر مصائب ٹوٹ پڑتے ہیں اور ان کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ ہو چکتا ہے اور کچھ زمانہ گزرنے کے بعد دوسرے مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے تو ان کے دل افسوس اور حسرت سے بھر جاتے ہیں مگر اس افسوس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گزشتہ ناقابلِ تلافی نقصان پر انسان ہاتھ ملتا رہ جائے یا جس طرح کسی کی موت پر اس کے رشتہ دار روتے ہیں۔ اس قسم کے افسوس سے حادثہ کے تدارک اور مصیبت و ہلاکت کی مدافعت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

علماء کو شارع علیہ السلام کی طرف سے یہ شرف عطا ہوا ہے کہ وہ وارثِ انبیاء کہلائے۔ اس وراثت کا حق ادا کرنے کے لئے علماء کا یہ فرض تھا کہ وہ دینی رابطہ کو زندہ کرنے کے لئے اُٹھیں اور ملک میں جو اختلافات پڑ گئے ہیں ان کا تدارک کریں۔ لوگوں میں اتحاد و اتفاق کا شعور پیدا کریں جو لوگوں کو دین کی طرف بلاتا ہے اور اس اتحاد و اتفاق کے مضبوط مراکز مساجد و مدارس میں قائم کریں تاکہ ہر مسجد اور ہر مدرسہ میں اتحاد کی رُوح چلتی پھرتی نظر آئے اور ان میں سے ہر ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جائے کہ جہاں ایک سرا ہلایا دوسرا بھی حرکت میں آگیا۔

اسی طرح کرۂ ارض کے مختلف اطراف میں علماء خطیب، امام اور واعظ ایک

دوسرے سے ربط پیدا کریں اور اپنے اپنے ملک میں اپنی تنظیم اور اتحاد کے مراکز قائم کریں جہاں اپنے اجتماعی اور اتحاد سے متعلق مسائل و حالات پر صحیح بچار کرنے کے لئے جمع ہو سکیں۔ قرآن اور سنت کے بتائے ہوئے مقام کی طرف عوام کی رہنمائی کریں۔ ان مختلف تعلیمات کو پھر ایک ادارہ سے وابستہ کریں جس کا مرکز بیت اللہ شریف ہو تاکہ ان کو دین کے مضبوط کرنے، سرکش لوگوں سے اپنے آپ کو بچانے اور اُمّت کی عظمت و ترقی کے راستے میں اجنبیوں کی مداخلت کے وقت ضروریات کی کفالت ہو سکے یہ مرکز علوم کی اشاعت افکار کی روشنی اور دین کی بدعت سے حفاظت کرنے میں کارآمد ثابت ہوں گے۔ کسی تنظیم میں مضبوطی اسی وقت آتی ہے جب لوگوں کے علمی درجات معیّن ہوں اور ہر ایک کے فرائض بھی مختص ہوں۔ یہ ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص کسی بدعت کو پھیلائے گا۔ تو مختلف طبقوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کی وجہ سے اس کا تدارک آسان ہوگا۔ اور عوام میں پھیلنے سے پہلے پہلے اسے مٹایا جا سکے گا۔ اس کے بعد اُمّت میں کلمہ کی بلندی اور آنے والے مصائب کا مقابلہ کرنے کی جو قدرت پیدا ہو گی وہ صاحبِ بصیرت لوگوں سے مخفی نہیں۔

اگرچہ یہ قریب ترین وسیلہ ہے مگر ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ مسلمانوں کے علماء اور عقلاء کے دل ابھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ ہاں بعض اربابِ غیرت نے حال ہی میں اس طرف توجہ کی ہے سچے مسلمان بادشاہوں اور عالموں

سے ہمیں امید ہے کہ وہ اس جماعت کی تائید کرنے اپنی جماعت کا اتحاد قائم کرنے اور اپنے عوام کو مختلف ہونے کے باوجود ایک مرکز پر جمع کرنے میں کسی قسم کی سستی نہ دکھائیں گے۔ تجربوں نے انہیں اب بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اب مزید انتظار کا موقعہ نہیں۔ یہ بات ان کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ دور افتادہ لوگوں تک مبلّغ پہنچا دیں اور جو لوگ ان کے قریب رہتے ہیں ان سے خود ہاتھ ملائیں اور ان کے ایسے حالات معلوم کریں جن سے ملّت اور دین کو فائدہ پہنچے یا کم از کم ضرر پہنچنے کا خطرہ نہ رہے۔ اس عظیم الشان کارنامے سے وہ ایک فریضہ ادا کریں گے۔ اور سعادت دارین کے مستحق ہوں گے۔ ابھی مسلمانوں میں زندگی کے چند آخری لمحے باقی ہیں اور اُمیدیں ان سے وابستہ ہیں۔

وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ (جانا اللہ کے پاس ہی ہے)

وہم

خداوند کریم! ہماری دل کی آنکھوں سے اوہام کے پردے ہٹا دے اور حقیقت کو اپنی اصلی شکل میں دکھا کر گمراہی اور بدبختی سے بچا!

بُرا ہو وہم کا کہ کبھی تو وہ کشمکش میں ڈالنے والے مصائب اور پُرخطر حوادث کا مظہر بنتا ہے اور کبھی مسرتوں اور طبیعت کو اُبھارنے والی خوشیوں کا سبز باغ دکھاتا ہے۔ دراصل وہ حقیقت کے لئے ایک آڑ یا پردہ بن کر اُسے بصیرت

کی نظر سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ ارادہ اور عزم پر وہم کا تسلط غالب ہے اس لئے وُہ برائی کو بڑھانے اور نیکی کو دبانے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

کمزور کو قوی، قریب کو دُور، امن کو خوف اور جائے پناہ کو ہلاکت گاہ کی شکل میں دکھلانا وہم کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہم نفس انسان کو اپنے محسوسات سے غافل کرتا ہے۔ موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود باور کرانا اسی کا کام ہے۔ وہمی ہمیشہ ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے۔ جو نہ کبھی کسی کے مشاہدہ میں آئی ہے اور نہ عالمِ حقائق میں کہیں اس کا وجود ہے۔ وہ مرگی کے مریض کی طرح لڑکھڑاتا ہے اور کوئی پتہ نہیں لگا سکتا کہ اُسے کیا ملا اور کیا رہ گیا۔ وہم ایک خبیث رُوح ہے جو نفسِ انسانی کو اُس وقت آدباتی ہے جب وُہ جہالت کے اندھیرے میں گھر گیا ہو۔ چھپ جانے سے انسان وسوسوں اور بیہودہ خیالات میں گرفتار ہو جاتا ہے یہ خبیث رُوح انسانی فکر کو اس عالم سے گمراہی کے جنگل کی طرف لے جا کر مجہولِ عالم میں گم کر دیتی ہے جہاں اسے نہ کوئی راستہ ملتا ہے اور نہ وہ کسی سیدھی شاہراہ پر قائم رہ سکتا ہے۔

انگریز قوم طاقت کے لحاظ سے مضبوط، ہتھیار کے لحاظ سے لیس اور فتوحات کے لئے ہر طرح آمادہ تھی۔ دوسری طرف مشرقی اقوام میں اختلاف اور نفسانی اغراض کی وجہ سے افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ وُہ مغربیوں کے حالات انکی عادتوں اور صنائع کی جان پہچان سے بالکل کورے تھے۔ انہیں ہر نادر صنعت ایک معجزہ معلوم ہوتی

تھی اور ہر نئی ایجاد کو ایک کرامت اور جادو سمجھتے تھے۔ چنانچہ انگریز نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مشرق کا رخ کر کے وہاں کے اکثر ممالک پر اپنا تسلط جمالیا۔ اہلِ مشرق کو مرعوب کرنے میں انگریزوں نے چند یورپین صنعتوں کی صرف چند نادر ایجادوں ہی سے کام لیا جن کی وجہ سے مشرقیوں کے دلوں میں قسم قسم کے وہم اور وسوسے پیدا ہوئے۔ انگریزی مکر و حیلہ کے جال جو اس نے مختلف طریقوں سے پھیلائے تھے ان وہموں کو اور بڑھانے اور قوی کرنے میں امداد دینے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ غریب مشرقیوں کے دل فریفتہ ہوئے اور وہ اپنے مملوکہ اموال اور قوتوں کی قیمت کو بالکل بھول گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی عقلوں کو مدہوش کر کے اور ان کے دلوں میں خطرات بڑھا کر انگریزوں نے ان کے مال کو لوٹ لیا۔ ان کی جاگیریں چھین لیں اور ان کو اپنی ملکیتوں سے بے دخل کر دیا۔ اس طرح انگریز قوم اس لوٹ کھسوٹ کی بدولت غنی بن گئی کیونکہ لوٹ کھسوٹ سے اس کو دولت اور رفاہیت کی زندگی نصیب ہوئی۔ آج وہ وسیع اطراف اور دور دور کے ملکوں پر حاکم نظر آتی ہے۔ اس کی طاقتیں ان اطراف میں منقسم ہیں۔ مشرق کے کسی ملک میں دیکھو وہ طاقت اور تعداد کے لحاظ سے بہت ہی حقیر نظر آئے گی۔ ان سارے مقبوضات میں یہ کمزور اور ضعیف ہیں اور کسی حملہ کو روکنا اور مدافعت کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے ان مقبوضات کی ایک ہلکی سی تحریک بھی اس طاقت کو متزلزل بلکہ سرے سے ختم کر سکتی ہے۔ انگریزوں پر بھی اب یہ بات بخوبی ظاہر ہو چکی ہے۔ اور وہ اپنی جاگیروں

کی نسبت ہر وقت خطرے میں رہتے ہیں اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ضائع ہونے کا خوف انہیں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ دُنیا کے ہر واقعہ اور ہر تحریک سے ان کے دل میں خطرہ اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ مشرق اور مغرب کا ہر نیا واقعہ ان انگریزوں میں سنسنی پھیلا دیتا ہے جو مختلف اطراف کے کمزور ممالک میں اس وقت بٹے ہوئے ہیں۔

ان حقائق کے باوجود اہلِ مشرق ان سے غافل اور اوہام کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس وہم نے ان کے دماغ میں گھر کر لیا ہے کہ انگریزوں کی حالت آج بھی ویسی ہے جیسی کبھی پہلے تھی۔ چنانچہ اہلِ مشرق کی حالت انگریزوں کے سامنے ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی جنگل سے گزرتا ہے۔ راستے میں شیر کی لاش پڑی ہوئی دیکھے۔ اس لاش میں حرکت اور زندگی کی کوئی نشانی نہیں لیکن اگر مسافر کو حقیقتِ حال کا علم نہ ہو اور اس خطرناک لاش کی تحقیق کیئے بغیر وہ اس خونخوار قوی اور پھاڑ کھانے والا درندہ تصوّر کرتا رہے تو لازماً اس پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ یا ڈر کے مارے وہیں جان دے دیگا یا خوف اور سراسیمگی کے عالم میں اندھا دھند بھاگنا شروع کر دے گا۔ اور راستہ گم کر کے بھٹکتا پھرے گا۔ اور ہو سکتا ہے ہے کہ اس گمراہی اور آوارہ گردی میں وُہ ہلاک ہو جائے۔ اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ یہ وہم صرف اہلِ مشرق ہی پر نہیں بلکہ خود یورپ کے دُوسرے ممالک پر بھی چھایا ہوا تھا۔ وہ انگریز کے دُور دراز مقبوضات کو اسی طرح مضبوط خیال

کرتے تھے جس طرح وہ جزائر برطانیہ میں مضبوط ہے۔ انگریز کی حکومت اس وہمی گنبد میں بند اور محفوظ تھی اور اس خیالی عظمت و بزرگی کے تخت پر چوکڑی لگائے بیٹھی تھی۔ انگریزوں کو اپنی طاقت کی کمزوری کا احساس ہے اور وہ اس پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ یہ پردہ وہم کا ہے۔ وہم سے زیادہ دبیز پردہ اور کوئی نہیں چنانچہ وُہ ہر حادثہ میں شور مچاتے۔ نعرے لگاتے اور مہیب آوازیں نکالتے ہیں اس طرح وہ اوہام و خطرات کو بھڑکا کر دیکھنے والوں کی توجّہ کو اپنی طرف سے ہٹاتے ہیں اور اصحابِ بصیرت کو حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں یہ حربے نہ ہوتے تو اہلِ مشرق و مغرب کی تھوڑی سی توجّہ ان کی حکومت پر قیامت لا سکتی۔ اور ان کو صفحہ ہستی سے مٹا سکتی تھی۔

انگریز اپنی مجتمع طاقتوں کو لے کر ہندوستان گئے اور فرانسیسیوں، ڈچوں اور پرتگالیوں کے ساتھ وہاں کے وسیع میدانوں میں مسابقت کی جدوجہد شروع کر دی۔ اور اس میں وہی جیت گئے کیونکہ وہ حیلہ سازی اور مکّاری میں ممتاز تھے اور دوسری طرف اُس وقت کے ہندوستانی غافل اور سادہ لوح تھے۔ اور وہ دھوکا کھا کر انگریزوں کی طرف مائل ہو گئے۔ اس طرح انگریزوں نے ان ممالک پر قبضہ کیا اور رفتہ رفتہ وہاں کے مستقل حاکم ہو گئے۔ دوسری حکومتوں کے لئے وہاں زمین کی چند تنگنائیں رہ گئیں جن کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں ہندوستان کے اِن سادہ لوحوں کو پہلے پہل اُنہوں نے یہ کہہ کر اپنی طرف مائل کیا کہ ہم تو

تمہیں فرانس، ہالینڈ اور پرتگال جیسی ظالم حکومتوں کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہیں یہ حکومتیں تم پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں اور ہم تمہیں آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

آج ہم انگریز کو ہندوستان، ہند چینی اور برما میں ۲۵[1] کروڑ آبادی پر حکومت کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان ممالک کا بچہ بچہ انگریزی تسلّط سے متنفر اور اس سے گلو خلاصی کا متلاشی ہے۔ وہ انگریزی تسلّط کی بہ نسبت ہر دوسری ظالم یا عادل سلطنت کو ترجیح دیتے ہیں۔ گویا ان قوموں کا ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ اس دُنیا میں کوئی سلطنت انگریز ایسی ظالم نہیں ہو سکتی اور تعلّی اور جبر و قہر میں انگریز ہر دوسری سلطنت سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ مگر اس کے باوجود کہ ان کے خلاف رعایا کے دل میں اتنی عداوت بھری ہوئی ہے ان کے ممالک پھر بھی وسیع ہیں اور ان کی سرحدیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ اس تسلّط سے پیچھا چھڑانے کے لئے بے تاب ہیں۔ صرف پچاس ہزار انگریز کی فوج نے انہیں اس ظالم حکومت کے سامنے جھکنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ حالانکہ ان ممالک کے اطراف میں بعض چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایسی ہیں جنہیں ابھی کسی نہ کسی درجہ میں استقلال حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں اور اپنی طاقت کو اکٹھا کریں تو تین لاکھ سے زیادہ فوج تیار کر سکتی ہیں حتّٰی کہ جو ممالک انگریزوں کے قبضے میں آچکے ہیں ان میں بھی ایسے افراد کافی تعداد میں مل سکتے ہیں جو ہتھیار حاصل کر کے ان کا مقابلہ بخوبی

---

[1] اب یہ آبادی چالیس کروڑ سے زیادہ ہے (مترجم)

کر سکتے ہیں۔

لیکن وہم نے ان کے حواس اور شعور پر قبضہ کر کے اُنہیں اپنے گرد و پیش اور اپنی اندرونی طاقتوں سے یکسر غافل کر دیا ہے۔ وہم نہ ہوتا تو انسانوں کی یہ کثیر تعداد جو طاقت میں بھی فائق ہے یوں ایک کمزور قوم کے پنجے میں جکڑی نہ جاتی جو اس وقت انہیں ذلّت و خواری کے عذاب میں گرفتار کیئے ہوئے ہے۔ اگر یہ سادہ لوح مشرقی باشندے اپنے اوپر عبرت اور غور کی ایک نظر ڈالتے یا خدا کی بخشی ہوئی اپنی طبعی قوّتوں کا صحیح اندازہ لگاتے اور انگریزوں کی کمزوری کی طرف دیکھتے تو نجات کی پناہ گاہ ان کو اپنے سامنے نظر آجاتی وہ چھٹکارے کا راستہ اپنے قدموں میں دیکھ لیتے اور ان کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اپنی جانوں اور ملکوں کو آزاد کرانے کے لیئے اُنہیں زیادہ تکلیف اُٹھانے، زیادہ مال صرف کرنے اور بہت زیادہ خون بہانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

بہت سی یورپین سلطنتیں انگریزی حکومت سے محض اس لیئے ڈرتی ہیں کہ وہ دیکھتی ہیں کہ اس کے قبضہ میں اتنے بڑے بڑے ممالک اور ایسی ایسی عظیم الشان قومیں ہیں کہ کسی حکومت کی رعایا کی تعداد ان کی برابری نہیں کر سکتی۔ پھر وہ انگریزوں کی طاقت کی جو حالت جزائر برطانیہ میں دیکھتی ہیں اس پر قیاس کرتے ہوئے سمجھتی ہیں کہ بعینہٖ وہی یا اس کے قریب قریب طاقت انہیں ان دور افتادہ مقبوضہ ممالک میں بھی حاصل ہو گی۔ ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہوتی کہ انگریز کا جسم طول و عرض میں اپنی وسعت سے

کہیں زیادہ پھیل گیا ہے۔ اگر اُسے ذرا بھی ٹھیس لگ جائے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا انگریزوں کی طاقت زمین کی اطراف میں منتشر ہے۔ کسی جگہ مضبوط نہیں۔ ہر ملک میں ان سے رعایا انتہائی طور پر ملول ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب کوئی اجنبی طاقت نے ور کا حملہ کرے اور کب ہمیں اپنے ظالم حاکموں کے خلاف بغاوت کرنیکا موقع ملے۔ اگر یہ حکومتیں جو انگریز سے ڈرتی ہیں حقیقت کی طرف دیکھیں تو ان کو برطانیہ کے ساتھ آمادۂ پیکار ہونے میں کسی تدبر اور مشورہ کی ضرورت ہی نہ پڑے گی اس لئے کہ یہ معاملہ اتنا ظاہر ہو چکا ہے کہ اب اس میں کسی دقیق غور و فکر کی حاجت نہیں۔ مگر ہاں وہم کا بُرا ہو کہ اس نے ساری حقیقتوں کو اپنے پردے میں چھپا رکھا ہے۔

دولتِ عثمانیہ، دولت برطانیہ کو بھی دولتِ روسیہ کی طرح سمجھتی ہے۔ اس بات سے کہ دولتِ برطانیہ کی حکومت ۲۵ کروڑ انسانوں پر چلتی ہے وہ سوچتی ہے کہ برطانیہ کا مقابلہ باعث ضرر ہے۔ مگر کاش ترک اپنی نظر کو ان سطحی اعداد و شمار سے آگے گہرائیوں تک پہنچا سکتے اور یہ معلوم کرتے کہ برطانیہ کی فوجی طاقت کیا ہے اور وہ میدانِ جنگ میں کتنے سپاہی کھڑے کر سکتی ہے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ کروڑوں انسانوں کی یہ تعداد درحقیقت برطانیہ کی طاقت کے حساب میں شامل نہیں بلکہ برطانیہ کے دشمنوں کی طاقت میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یہ تعداد ان فرصتوں کا انتظار کر رہی ہے جن میں اسے برطانیہ کی اطاعت کے قلادہ سے گردن چھڑانے کا موقع ملے جونہی برطانیہ کی کسی حکومت کے ساتھ جنگ چھڑی، یہ ۲۵ کروڑ

انسان خود انگریزوں سے برسرِ پیکار نظر آئیں گے۔ خصوصاً ہندوستان کے ۵ کروڑ مسلمان تو دولتِ عثمانیہ کو اپنا قبلہ اور جائے پناہ سمجھتے ہیں اور ہندوستان کی جنگی قوموں میں انہی کا پہلے درجہ میں شمار ہوتا ہے۔ کاش ترکوں کو پتہ ہوتا کہ برطانیہ یہ ظاہر کرکے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے کہ وہ دولتِ عثمانیہ کی حلیف و مددگار ہے اور اس کے حقوق کی حمایت کرتی ہے۔ خدا کی قسم اگر عثمانیوں کو اُس خفیہ تسلّط کا پتہ ہوتا جو انہیں انگریزی رعایا کے دلوں پر حاصل ہے اور وہ اُسے ہوشمندی کے ساتھ استعمال کرتے تو مصر کے معاملے میں انگریزوں کی بے جا مداخلت کے مقابلہ میں انہیں صبر کے تلخ گھونٹ پینے نہ پڑتے۔

عرابی پاشا کی تحریک کے وقت مصر کے باشندے دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو اُسی پرانی حالت پر رہنا چاہتے تھے اور اُسی دستور پر قانع تھے جو توفیق پاشا جاری کر رہا تھا اور دوسرے وہ جو ایک طرف عرابی پاشا کی طرف بھی مائل تھے اور دوسری طرف سے پُرانی رسم کے تسلّط سے بھی خائف تھے۔ اس دوسرے فریق کو اپنے لئے ایک واضح نصب العین متعین کرنے میں شکوک و شبہات لاحق تھے اور شکوک و شبہات کے ہوتے ہوئے کبھی عزیمت پیدا نہیں ہو سکتی اور پہلا فریق تو کمزوری اور ہمت شکنی کی پستی میں پہنچ ہی چکا تھا۔ اس لئے انگریزوں کو مصر پر قبضہ کرتے کچھ دیر نہ لگی اور وہ کسی لڑائی کے بغیر ممالک مصریہ میں داخل ہو گئے کچھ دھمکی کچھ لالچ، کچھ حیلے اور کچھ ریشہ دوانیاں یہ ان کے ہتھیار تھے۔ اسے اپنا تسلّط قائم

کرنے کے لئے حالات سازگار ملے اور اس نے یہاں اپنے قدم جمالئے۔ اس طرح مصریوں کا اجتماعی رشتہ ٹوٹ گیا۔ اور عرابی پاشا کی تحریک ناکام ہو گئی۔

اس کے باوجود کوئی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ انگریز ان کے وطن میں سے کچھ حصّہ مانگتے ہیں وہ یہی سمجھتے کہ انگریز صرف توفیق پاشا کی تائید کرنے اور ان کو باغیوں کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے آئے ہیں۔ ایک طرف مصریوں کو انگریزوں کے متعلق یہ حسنِ ظن تھا۔ دوسری طرف انہیں ایک مضبوط حجت یہ مل گئی کہ شرعی سیادت کا مالک (مفتی) انگریزی تصرّف پر راضی ہے۔ اس لئے انہوں نے انگریز کا مقابلہ کرنے میں سستی دکھلائی۔ نتیجہ یہ کہ انگریز کے قدم جم گئے۔ لیکن آج جب کہ اس دھوکے اور فریب کو ظاہر ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ مصریوں میں آپ کو ایک فرد بھی ایسا نہیں ملیگا جو ان کی طرف مائل ہو۔ آج مصری نوجوان انگریزوں سے سخت متنفر ان کے خاتمے کے متمنّی اور انہیں نیست و نابود کرنے میں عملی حصّہ لینے کے خواہشمند ہیں۔

وہم خوف کو مجسّم بنا کر پیش کیا کرتا ہے اور پختہ ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ شاید مصری ان اسباب کو بھولے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے انگریزوں کو ان کے ملک پر قبضہ کرنے کا موقع ۔ شاید ان کا گمان یہ ہے کہ مصریوں نے متحد و متفق ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا اور انگریز نے اپنی طاقت سے انہیں دبایا ہے۔ شاید مصری اپنے ان آپس کے جھگڑوں کو بھول گئے جن میں وہ اس وقت مبتلا تھے جب انگریزوں نے ان کے ملک پر قبضہ کیا۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ انگریز ان کے ملک

میں خود انہی کی مدد سے داخل ہوئے۔ یہی تو وہ عجیب وہم ہے جس نے اہلِ مصر کی نظر سے حقیقت کو اوجھل کر رکھا ہے اور جس کی بنا پر یہ لوگ آج سے دو سال بیشتر انگریزی عساکر کے وادیٔ نیل میں ڈیرا ڈالنے میں آلۂ کار بنے رہے جن لوگوں کی مدد کے بغیر انگریزوں کے قدم یہاں جم ہی نہیں سکتے تھے وہی آج یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی فوجیں مصر کے تمام باشندوں کو دبانے اور برطانوی حکومت کے سامنے جھکانے پر قادر ہیں۔ اسی غلط گمان کی وجہ سے وہ اپنے ہموطنوں کے ساتھ منافقانہ طور پر صلح وسلامتی کا سلوک کرتے ہیں اور دنیا دکھاوے کو ان کی خواہشات میں شریک رہتے ہیں۔

ایک غور وفکر کرنے والے کی طرح مصری کیوں انگریز کی طاقت کا ناقدانہ اور گہرا مطالعہ نہیں کرتے؟ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں یہ معلوم ہو جائیگا کہ انگریز ایڑی سے لے کر چوٹی تک کا زور لگالیں تب بھی مصر اور سوڈان ۲۰ ہزار سے زیادہ لشکر نہیں بھیج سکتے کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ جب انگریزی فوج سوڈان میں مشغول ہو۔ اسی وقت شرقیہ، بحریہ اور فیوم میں ایک خفیف سی تحریک شروع ہو جائے تو انگریز یقیناً زبردست اُلجھن میں پڑ جائے گا۔ اس کے عزائم سست ہو جائیں گے اور وہ ان ممالک کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیگا مگر خدا وہم کا بُرا کرے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریز کے پاس بحری طاقت کافی ہے مگر اس طاقت کا مبلغ ومنتہا وہی ہے جس کے آثار سواکن میں ظاہر ہو چکے ہیں جو

مقامات سمندر سے دو کوس سے زیادہ دُور ہیں ان میں انگریز کی بحری طاقت کا کچھ بس نہیں چل سکتا۔ اگر بالفرض وہ ساحلوں پر چند گولے چھوڑ ہی دیں تو کیا وہ گولوں کے سائے میں ہمیشہ زندگی بسر کر سکتے ہیں؟ اور پھر ایسی صورت میں جبکہ مُلک کے باشندے اندرون ملک سے ان کے خلاف برسرِ پیکار ہوں اور انہیں اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی برّی طاقت موجود نہ ہو۔

صحیح فیصلے کے راستے میں وہم سے بڑی کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس وہم کے پردے مغربی باشندوں کی آنکھوں سے ہٹ گئے اور انہیں انگریز کی حقیقت معلوم ہو گئی۔ یعنی ایک کمزور طاقت جو اپنے ہتھکنڈوں کے بل بوتے پر مضبوط طاقتوں کے حقوق پر حملہ کرتی ہے —— بلند آواز اور بوسیدہ جسم —— مغربی اقوام نے یہ سمجھ لیا ہے کہ باقی قوموں کے حق میں انگریز اس تنہا کیڑے کی طرح ہے جو اپنی کمزوری کے باوجود صحت کو بگاڑتا اور جسم کو ہلاک کرتا ہے۔ چنانچہ یہ اقوام اب اُس کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ وہم مشرقیوں کے دل سے بھی نکل جائے اور وہ بھی ان واقعات سے کچھ سکھیں اور اپنے معاملات کو استقلال سے ہاتھ میں لے لیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی میں گرفتار ہو جائیں اور ایک سردار کو ہٹا کر دوسرا اجنبی سردار اپنے اوپر مسلّط کر لیں اے اللہ ہم سے وہموں کے پردے ہٹا اور اپنے معاملات میں ہمیں رشد و ہدایت کا راستہ دکھا۔ ہمیں گمراہی سے بچالے اور کسی نیک مقصد کی طرف ہماری رہنمائی فرما۔

حفاظتِ حکومت

اَفَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَتَکُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ یَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ یَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ

(کیا یہ لوگ ملکوں میں چلتے پھرتے نہیں - ان کے پاس دل ہوتے جن سے سمجھتے بوجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے - حقیقت یہ ہے کہ (جب کوئی اندھے پن میں پڑتا ہے تو) آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں (جو چہروں پر ہیں) دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں)
کتنی قومیں تھیں جو حکم خداوندی سے ہلاک ہو گئیں - کتنے قبیلے تھے جو اس کی مشیت سے نیست و نابود کر دیئے گئے اور کتنے ملک تھے جو اس کے ارادے سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے - خداوند کریم کا عدل اسی طرح ایک قوم کو دوسری قوم سے بدل کر زمانے کے لئے ایک نئی قوم پیدا کرتا ہے - وہ حکمت و دانائی والی ذات جس کی رحمت غضب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور غالب ہے ہر عمل کے لئے جدا جدا بدلے - ہر نئے واقعہ کے لئے اسباب مقرر فرمائے ہیں وَلَا یَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (تمہارا خدا کسی پر بھی ظلم نہیں کرتا) اس کے کام بلا ترتیب صادر نہیں ہوتے. اور نہ کوئی کام بلا مصلحت ظہور میں آتا ہے - اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ حکم فرمایا ہے کہ زمین میں چلیں پھریں - قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ

عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ[1]) اور میرے سچے اور منصفانہ فیصلے کا مشاہدہ کریں جو قرونِ اولیٰ کی اقوام اور دورِ حاضر کے جانشینوں میں یکساں طور پر جاری وساری ہے اور اس مشاہدہ کے بعد اس کے احکام کی اطاعت کریں اور اس کے مقرر کردہ قوانین کے حدود سے تجاوز نہ کریں ۔ اور دُنیا کی بھلائی اور آخرت کی سعادت حاصل کریں جس کو خدا نے دِل دانا، چشمِ بینا، اور عقلِ سلیم عطا فرمائی ہو، وہ دنیا کے حوادث کو ایک ایک کر کے غور سے دیکھے، قوموں میں انقلاب کی کیفیت کا مطالعہ کرے، قرونِ ماضیہ کے اقوام کی تاریخ کو گہری نظر سے پڑھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کتاب میں جو ارشادات بیان فرمائے ہیں، ان سے عبرت حاصل کرے تو اُسے بلاشبہ یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کسی قوم پر جب بھی کوئی عذاب آیا ہے ۔ جب بھی وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوئی ہے اور جب بھی اُسے کسی بڑی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اس نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا، اللہ کے حدود سے تجاوز کیا ۔ اس کے حرام ٹھہرائے ہوئے افعال کا ارتکاب کیا ۔ اس کے منصفانہ قوانین کو توڑا ۔ اس کی سچّی شریعت سے منہ موڑا ۔ قوانینِ الٰہی کو غلط طریقہ پر دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنی خواہشات اور اغراض کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے کلام کی غلط تاویلیں کیں ۔

جس طرح خدائے قادر ودانا نے یہ قانون مقرّر فرمایا ہے کہ مزاجوں پر غذاؤں

---

[1] آپ ان سے فرمائیں کہ زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ خدا کی آیتوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا ۔

اور دواؤں اور مختلف موسموں اور ہواؤں کا نمایاں اثر پڑتا ہے، اسی طرح اس کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر عمل اور ہر وضع بھی انسان کی ہیئتِ اجتماعی پر باقاعدہ اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی لئے اس اس نے اپنے بندوں پر مہربانی کی، اُن کے لئے حدود مقرر فرما کر اور احکام بیان کر کے بُرائی بھلائی میں تمیز کرنے اور نفع و ضرر کو ایک دُوسرے سے جُدا کرنے کا سامان مہیا فرمایا۔ رسُول بھی بھیجے اور کتابیں بھی نازل فرمائیں۔ اب جو کوئی احکامِ خداوندی کی مخالفت کریگا وہ اپنے آپ پر خود ظلم کریگا۔ اور اُسے دُنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

زندگی اور اس کے افعال پر کائنات کی جڑی بوٹیوں کی تاثیر کے اسباب ایک ماہر طبیب تک کی نظر سے غائب رہ سکتے ہیں مگر انسان کی اجتماعی ہیئت پر ان انفرادی حالات کے اثرانداز ہونے کا راز وہ راز ہے جس پر مطلع ہو جانا ہر اُس شخص کے لئے آسان ہے جو اپنی بصیرت کی آنکھ ضائع نہ کر چکا ہو۔

کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے مصالح عامہ کے لئے اتفاق رائے جماعتی فوائد کے حصول کے لئے الفت و محبّت کی شیرازہ بندی اور دنیوی زندگی کی راحت کے لوازم کو حاصل کرنے، قوت پکڑنے اور آخرت کی لازوال سعادت تک پہنچنے کے لئے طاقت حاصل کرنے کو ایک اہم سبب بنایا ہے۔ اُسی طرح اس کے قانون کے مطابق باہمی حسد اور آپس کے تنازعات کمزوری کا سبب بنتے ہیں۔ اور انسان کو پستی کے ایسے گڑھے میں دھکیلتے ہیں۔

جہاں وہ دُنیا اور آخرت کے ہر فائدہ سے محروم رہ جاتا ہے اور قوموں کی حالت کو یہاں تک گرا دیتے ہیں کہ وہ حملہ آور اور سفّاک قوموں کے پنجے میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ جو شخص سابقہ اور موجودہ اقوام کے حالات پر نظر ڈالے گا۔ اگر وہ دل کی بیماری اور بصیرت سے محرومی کا مریض نہ ہو، تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس امر (وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا)[1] اور اس کی اس نہی (وَلَا تَفَرَّقُوا وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ)[2] کے راز کو اچھی طرح پہچان لے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرّر فرما دیا ہے کہ جس کام میں اس شخص پر اعتماد کیا جائیگا جو قابلِ اعتماد نہ ہو اور جس کا آسرا لینا کارآمد نہ ہو وہ کام خلل پذیر اور فاسد ہو جائیگا۔ اگر دو شخصوں کی طبیعت میں کوئی لگاؤ نہیں۔ ان دونوں کے درمیان کوئی حقیقی تعلق نہیں۔ وہ دونوں کسی صحت مند رابطہ میں مربوط نہیں ان میں سے ایک کی طبیعت میں وہ جذبہ ہی نہ ہو جو دوسرے کی مصلحت کی رعایت کرنے اور اس کا راز چھپانے پر آمادہ کرے۔ نہ اُس کی فطرت میں وہ داعیہ ہو جو اپنے ساتھی کو نفع پہنچانے اور اس کی تکلیفیں دُور کرنے کے لئے تیار کرے اور پھر بھی مؤخر الذکر اپنے کام میں اس پر اعتماد کرتا رہے تو اس میں کیا شک ہے کہ ایسے شخص کا انجام بُرا ہو گا۔ اگر وہ بادشاہ ہے تو اس کی سلطنت ختم ہو جائے گی اور حاکم ہے تو اُس کی حکومت جاتی رہے گی۔ دُنیا کے

---

[1] خدا کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو

[2] ایک دوسرے سے جُدائی مت اختیار کرو، ورنہ تم سُست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

حوادث اس بات کی گواہی دیتے ہیں اور فریب خوردہ لوگوں کے واقعات صاف بتا رہے ہیں جو شخص بصیرت کی آنکھیں نہ کھو چکا ہو وہ اوّلین توجہ میں اللہ تعالےٰ کے ان احکام کو پہچان لے گا۔ مثلاً یہ حکم (لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ[1]) اور یہ حکم (لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ[2]) اور اس کے علاوہ سارے احکام جو انتہائی حکمت پر مبنی ہیں اور دین و دنیا کی مصلحتوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ہر شخص کے ذمّے اپنی قوم کے مخصوص طبقے کے لئے ایک متعیّن عمل ہے اور اس دنیا میں ایک پاکیزہ زندگی کو حاصل کرنے اور آخرت میں ایک عمدہ مقام تیّار کرنے کے لئے اس عمل کو سرانجام دینا اس پر فرض ہے۔ انسان کا ایک ہی دل ہے اور اگر وہ اسے صرف ایک ہی چیز کے حصول میں صرف کرے تو باقی اشیاء اس سے فوت ہو جائیں گی۔ اس لئے اگر وہ نفسانی خواہشات میں بڑھتا چلا

---

[1] میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ تم ان کے پاس دوستی لے کر جاتے ہو حالانکہ وہ اس سچائی پر کافر ہو چکے ہیں جو تمہارے پاس آئی۔

[2] اپنے سے زیادہ دوسرے لوگوں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہ کریں گے۔ تم جس قدر تکلیف میں رہو ان کی خوشی پوری ہوتی ہے۔ دشمنی ان کی زبانوں سے (بھی) ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

جائے۔ عیش وتنعم کے انتہائی درجوں کو اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جو احسانات کئے ہیں ان کے بارے میں اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو وہ اپنے فرائض کو بیکار کر کے اپنے نفس کو نقصان پہنچائے گا۔ وہ اپنے فائدوں سے محروم ہو کر خداوند تعالیٰ کے شدید ترین عذاب کا مستحق ہو گا اور دنیا و آخرت دونوں لحاظ سے خسارہ میں رہے گا۔ بسا اوقات اُس کے کارناموں کے بُرے اثرات اس کے قرب وجوار میں رہنے والوں پر بھی پڑیں گے اور اس نے اپنے فاسد اخلاق اور قوانینِ الٰہی سے انحراف کر کے جو آگ بھڑکائی ہے وہ اس کے دیگر ہموطنوں اور رفقاء کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ ناز ونعم کی زندگی بسر کرنے والوں کی جیتی جاگتی تصویریں آج بھی گواہی دے رہی ہیں۔ ہاں ان کی آواز بہرے کانوں کے لئے بے معنی اور ان کی حالت اندھی بصیرت کی نظروں سے چھپی ہوئی ہے۔ ورنہ عبرت کے لئے تو وہ آیتیں بھی بہت کافی ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ان خوشحال لوگوں کے حالات بیان کئے ہیں مثلاً وکم اھلکنا[1] من قریۃٍ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعد ھم الا قلیلا وکنا نحن الوارثین۔ حتی اذا اخذنا مترفیھم بالعذاب[2] اذا ھم یجئرون۔

---

[1] اور کتنی بستیاں ہم نے غارت کردیں جو اپنے گزران میں اترا چلی تھیں۔ اب یہ ہیں ان کے گھر جو ان کے بعد بہت ہی تھوڑے آباد ہوئے اور ہم ہی آخر کو سب کچھ لینے والے ہیں۔

[2] یہاں تک کہ جب ہم ان کے آسودہ لوگوں کو آفت میں پکڑیں گے تو وہ چلّانے لگیں گے۔ آج مت چلّاؤ تم ہم سے چھوٹ نہ سکو گے۔

لا تجأروا الیوم انکم منا لا تنصرون - ذالکم[1] بما کنتم تفرحون فی الارض بغیر حق و بما کنتم تمرحون -

جو لوگ اپنے مال و متاع کی وجہ سے ان فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم کر دیئے ہیں ان کے انجام یہی ہوتے ہیں - و من اعرض عن ذکری فانّ لہ معیشۃً ضنکاً و نحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ[2]۔

علم کے سمندر میں سے انسان کے حصّے میں چند قطرے ہی آئے ہوں گے - اکیلا ایک انسان ان ساری چیزوں اور کاموں کو نہیں جانتا جو اس کے لئے مفید ہوں اور جن اشیا یا کاموں کو وُہ مفید جانتا ہے - ان کے حصول کے ذرائع اس کی نظر سے پوشیدہ ہیں اسی طرح جن جن اشیاء سے ان کو ضرر پہنچ سکتا ہے ان کے متعلق پُورا پورا علم اور اس سے بچنے کی تدابیر پر احاطہ اس کی طاقت سے باہر ہے - انسان پیدائشی طور پر ہی کمزور ہے اس کی کمزوری کی تلافی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنے بنی نوع انسان سے امداد لینے کے طریقے سکھا دیئے - وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا[3] - ہمیں نصرت کا محتاج اور امداد کے لئے

---

[1] یہ اس کا بدلہ ہے کہ تم زمین میں ناحق اتراتے پھرتے اور اکڑتے تھے۔

[2] اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگی کی گزران ملتی ہے اور ہم اس کو قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

[3] اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

بیقرار پیدا کیا اور پھر ایک دوسرے کو امداد دینے اور آپس میں تعاون کا طریقہ بتایا۔

یہ نتائج ایسے ہیں جنہیں عقل ہر ایک شخص کے مصالح پر غور کرتے کرتے اخذ کرتی ہے۔ پھر اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایک پوری قوم کی حفاظت کا ذمہ دار اور کفیل بنایا ہو تو اس قوم کی نقل و حرکت اور عزل و نصب کا مختار کُل بھی وہی ہوگا۔ ایسا شخص بلاشبہ تجربہ کاروں سے مشورہ لینے اور ان کی رائے سے فائدہ اُٹھانے کا زیادہ محتاج ہے۔ اسے اس شخص کے مقابلے میں اس مشورہ کی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ جو صرف اپنی ذات سے متعلق جد و جہد میں مصروف ہے۔ پھر جتنا اس کا حلقۂ اقتدار وسیع ہوگا اتنی ہی صلاح مشورہ کی حاجت بھی بڑھ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو معصوم ہونے کے باوجود تعلیم اور ہدایت کے طور پر فرمایا وشاورھم فی الامر (معاملات میں ان سے مشورہ لو) اور اسی طرح مومنوں کی تعریف میں یہ خصوصیت بیان کی وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہیں) پھر ہمیں کیوں اس سیدھے اور صاف راستے کا پتہ نہیں چلتا۔

افلم یدبروا القول ام جاءھم مالم یأت اباءھم الاولین۔[1]

کسی ملک کا امیر یا کسی سلطنت کا مالک اگر تھوڑی دیر کے لئے اپنی طرف متوجہ ہو تو اُسے معلوم ہوگا کہ اس کا وطن ہر وقت لالچیوں کے نرغے میں ہے۔ انسان فطری طور پر ہر وقت اپنے پڑوسیوں کے ملک پر قبضہ کرنے کی فکر میں رہتا ہے،

---

[1] کیا انہوں نے بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ علم آیا جو انکے پچھلے باپ دادوں کے پاس نہیں آیا۔

چنانچہ وہ دیکھے گا کہ اس کے پڑوسی یہی چاہتے ہیں کہ اس کی قوم کو ذلیل کریں۔ باشندگانِ ملک کو غلام بنائیں۔ ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی محنت کا پھل ان کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے ہم وطنوں کو دلائیں۔ اس لئے بادشاہ اس کی نیابت کرنے والے گورنروں اس کے لشکر کے کمانڈروں اور دیگر اربابِ اقتدار کا فرض ہے کہ وہ جبر و تشدد کے حادثات کی مدافعت کرنے اور اجنبی حملوں کو روکنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو جائیں اگر انہوں نے بچاؤ کے اسباب اور ان ذرائع کے مہیا کرنے میں سستی دکھائی جو لالچ کے سیلاب کو ان کے راستے سے ہٹا دیں۔ اپنی قوت کو مضبوط کرنے اور سطوت کو بڑھانے والی ہر طاقت سے کام نہ لیا۔ تو وہ اپنے ملک کو ہلاکت کا لقمہ بنائیں گے اور اپنے آپ کو خطرات کے عمیق غاروں میں دھکیل دیں گے۔

یہ ایسی چیزیں ہیں جنہیں دانا اور نادان دونوں جانتے ہیں اور جاہل و عالم سب کی نظریں ان پر پڑتی ہیں۔ یہی راز ہے جسے اللہ تعالٰی نے واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃٍ[1] کی آیت میں وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اس آیت میں قوّت اور آلاتِ حرب کی تیاری کا ایک عام حکم دیا ہے اور اس کی مقدار کی کوئی تعیین نہیں کی بلکہ اُسے استطاعت کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ جس کی حالت زمانے کے تقاضے اور خطرناک دشمنوں کے حالات کے مطابق مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ ہے اللہ تعالٰی کا حکم، غافل آدمی کو اس سے متنبہ ہونا اور بھولنے والے

---

[1] اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے طاقت کا ہر وہ حربہ تیار رکھو جو تمہارے بس میں ہو۔

کو اس سے چونک جانا چاہئے۔ فَمَالِ هٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا یَکَادُوْنَ یَفْقَهُوْنَ حَدِیْثًا۔[1]

ہر حق دار کو اس کا حق دینا۔ ہر چیز کو مناسب جگہ دینا اور سلطنت کا کاروبار انہی لوگوں کے سپرد کرنا جو اسے سرانجام دینے پر قدرت رکھتے ہوں وہ بنیادی اسباب ہیں جو ملک کو محفوظ رکھتے۔ یہی بادشاہ کی طاقت بڑھاتے۔ شوکت و تسلط کی بنیاد مستحکم کرتے اور داخلی نظام کو خلل سے بچاتے ہیں اور انہی میں قوموں کی نفسانی بیماریوں کے علاج کا راز پوشیدہ ہے۔ فطری فیصلہ یہی ہے۔ زمین و آسمان کی عمارت اور موجودات کا نظام اسی تدبیر و حکمت سے برقرار ہے شریعت کی اصطلاح میں جس چیز کو عدل کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ[2] میں دیا ہے۔ اس سے یہی طریق کار مراد ہے۔ جس طرح باقی اجزائے عالم کے بارے میں سیدھا راستہ چھوڑنا اور اعتدال سے تجاوز کرنا ان کی ہستی کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح اجتماع انسانی کے بارے میں جادۂ اعتدال کو چھوڑ دینے سے اس کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے احکام خداوندی میں عدل کے متعلق پوری تاکید کی گئی ہے اور قرآن مجید نے ظلم و جور سے پورے طور پر روکا ہے اور اس بارے میں اوامر و نواہی کے مخاطب زیادہ تر ارباب حکومت ہی ہیں۔ عدل ہی وہ صفت ہے

---

[1] پھر خبر نہیں ان لوگوں کو کیا ہوا جو کسی بات کو سمجھتے بھی نہیں ہیں۔

[2] بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔

جس کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے لفظِ حکمت سے کر کے اسے خیرِ کثیر قرار دیا ہے۔ (وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا) عدل اللہ تعالیٰ کے صفاتِ عالیہ کے مظاہر میں سے ایک عظیم الشان مظہر ہے کیونکہ حاکم و عادل اور لطیف و خبیر اللہ تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔

جو شخص زمین میں پھر کر قوموں کی تاریخ تلاش کرے اور اس کے دل میں بصیرت کی روشنی بھی ہو تو اس کو یہ معلوم ہوگا کہ کسی ملک کی عمارت کا گر جانا اور کسی سلطنت کا تختہ اُلٹ جانے کے اسباب مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:-

اختلاف و افتراق، کسی ناقابلِ اعتماد پر اعتماد اور اجنبی عنصر کی دخیلکاری حکومت میں خود رائی کا اظہار اور مشورہ سے انکار۔ قوّت کی فراہمی اور ملک کے بچاؤ کی تدابیر سے بے پروائی۔ جس آدمی میں کام کو سرانجام دینے کی صلاحیّت نہ ہو اُسے کام سپرد کرنا اور اشیاء کا بے موقع استعمال اسی طرح حکم میں بے انصافی اور نظم و نسق میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے قوانینِ فطرت کا خلاف لازم آتا ہے۔ اور پھر خطا کار لوگوں پر احکم الحاکمین کا غضب نازل ہوتا ہے۔

اگر ہم ان آیتوں کو غور سے پڑھیں اور ان حوادث پر عبرت کی نظر ڈالیں جو ملّتِ اسلامیہ اور ممالکِ اسلامیہ کو پیش آئے ہیں تو معلوم ہوگا کہ ہم میں کئی تو

؎ جس شخص کو حکمت سے نوازا گیا تو بلاشبہ اُسے ایک بہت بڑے خیر سے نوازا گیا۔

ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے لائحہ عمل سے ہٹ گئے اور اس صراط مستقیم سے کنارہ کر گئے جو ہمارے لئے مقرر کیا گیا تھا اور جس کی طرف ہماری رہنمائی کی گئی تھی اور کئی ایسے ہیں جو اپنی نفسانی خواہشات کے پیرو اور شیطان کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ ذٰلکؐ بان اللہ لم یک مغیراً نعمۃً انعمہا علیٰ قوم حتٰی یغیروا ما بانفسھم وان اللہ سمیع علیم - اس لئے پختہ کار علماء کا جو ملتِ اسلامیہ کے روحِ رواں اور قائد ہیں - یہ فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کو متنبہ کرنے اور خواب سے جگانے کا اہتمام کریں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے ہوئے فرائض اور دین کی مقرر کردہ عبادات سے غافل ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ جاہلوں کو سمجھا دیں۔ بے خبروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہلا دیں اور سب کو ان نعمتوں کی یاد دلائیں جو ان کے باپ دادوں پر خداوند تعالیٰ نے فرمائی ہیں۔

مسلمانوں کو اس بات کی طرف توجہ دلانا علماء ہی کا فرض ہے کہ اگر وہ سیدھے راستے پر قائم رہیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے بہت کچھ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں اور اگر انہوں نے اپنے حالات کی اصلاح نہ کی۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طرزِ زندگی کی طرف دوبارہ واپس نہ آئے اور جو بدعات اور

لہ یہ بات اسی سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے۔ جب تک کہ وہی لوگ اپنے اعمال کو نہیں بدل ڈالتے اور بیشک اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے اور بڑے جاننے والے ہیں۔

۔ اور بُری عادات کتاب الٰہی کی تصریحات کے مطابق نہیں ہیں ان سے بیزاری اور کنارہ کشی اختیار نہ کی تو اس کے نتائج ان کے حق میں بہت بُرے ہوں گے

علما کا یہ فرض ہے کہ مسلمانوں کو قدیم اقوام کے حالات سنائیں اور بتائیں کہ جب ان لوگوں نے خدا کے قوانین و احکام کی مخالفت اور ان سے روگردانی کی تو ان کے متعلق قلمِ تقدیر کا فیصلہ کیا ہوا فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ[1]۔

علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا وہ سچا اور آزمودہ وعدہ یاد دلائیں جو اس آیت میں کیا گیا ہے وعد اللّٰہ الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا[2]۔ علماء کا فرض ہے کہ ایسی آیتیں سُنا کر مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکالیں۔

---

[1] اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی زندگی میں عذاب میں مبتلا رکھا اور ان کے لئے آخرت کا عذاب کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش! وہ غور کرتے۔

[2] جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ان کے ساتھ اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین کا وارث بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا اور ان کو اپنے اس دین پر قدرت دے گا جو ان کے لئے اللہ نے پسند کیا ہے۔ اور ان کو خوف کے بعد امن نصیب فرمائے گا۔

یہ پختہ کار علماء کا فرض ہے۔ مسلمانوں میں ایسے علماء کی کمی نہیں۔ کیا وہ دین کے امانت دار، شریعت کے حامل۔ علم اسلام کو بلند کرنے والے ہو کر اور مسلمانوں کی نگہبانی کی ذمہ داری خداوند تعالیٰ کی طرف سے لے کر بھی ان فرائض کے ادا کرنے میں سستی دکھائیں گے۔ میرا گمان ہے کہ ان کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے بہترین اعمال ادا کرنے میں امداد دے اور ان کی ہدایت سے عام مسلمانوں کو نفع پہنچائے۔

اُمیدؔ

اِنَّہٗ لَا یَیْئَاسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ ۔

(بیشک اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے والے وہی لوگ ہیں جو منکر ہیں)

وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَۃِ رَبِّہٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۔

(گمراہوں کے سوا کون ہے جو اپنے پروردگار کی رحمت سے نااُمید ہو سکتا ہے)

قرآن حکیم کی یہ آیتیں ایک عظیم الشان راز کا پتا بتاتی ہیں ۔ جس کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ نوع انسانی کو باقی عالم پر رفعت عطا کرتا ہے اور جس کے مطابق انسان تعریف کے اس بلند مقام پر اور اپنے حسب حال کمال تک پہنچتا ہے جو قسّامِ ازل نے اس کے لئے مقرّر فرمایا ہے ۔

ذرا اپنے نفس کی طرف رجوع کرو اور دل کی آواز پر کان لگا کر سنو تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے جذبات میں ایک بڑھتی ہوئی امنگ ایک دبی دبی سی خواہش موجود ہے جو تمہیں عزّت کی طلب اور اپنے ہم قبیلہ اور ہم جنس افراد میں بلند مرتبہ حاصل کرنے پر آمادہ کرے گی ۔ اسی پر پوری قوم کی ہیئت اجتماعیہ کو قیاس کر لو ۔ جس طرح افراد میں ترقّی کا جذبہ موجود ہے اُسی طرح پوری قوم میں بھی دوسری قوموں پر فوقیّت حاصل کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے ۔ یہ ایک فطری

جذبہ ہے جو خدا نے نوعِ انسان کے فرد اور جماعت دونوں کی فطرت میں ودیعت کر رکھا ہے۔

عزّت اور بلندیٔ درجات کے سچے متلاشی کا اپنے مقصد تک رسائی حاصل کرنا معمولی بات نہیں اسے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر اس کے باوجود اس کی یہ خواہش کمزور نہیں ہوتی وہ اپنے راستے کو ہموار کرتا ہوا اور اس کے کانٹوں کو صاف کرتا ہوا برابر آگے بڑھتا رہتا ہے اور عزّت برتری کے بلند مقام پر جا کر ہی دم لیتا ہے۔ اگر کہیں اس کی رفتار میں رکاوٹ پیش آ جائے اور وُہ ٹھہر جانے پر مجبور ہو جائے تو وہ دہکتے انگاروں پر لوٹنے والے کی طرح بے قرار اور پریشان نظر آئے گا۔

اگر کوئی محقّق انسانی اعمال کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرے کہ جو جو کام انسان کرتا ہے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے تو معلوم ہو گا کہ بیشتر انسانی اعمال کا محرّک عزّت اور بلند مراتب کی طلب ہے اگرچہ عزّت اور مراتب کی بلندی کا معیار ہر انسان کے سامنے مختلف ہے اور اس تک رسائی کے وسائل سب کو یکساں میسّر نہیں جو عمل اور جد وجہد سامانِ معیشت مہیّا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ وہ ان اعمال کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو عزّت کے حصول کی خاطر کئے جاتے ہیں۔ معمولی مزدوروں اور پیشہ ور جماعتوں سے لے کر حکومت کرنے والے طبقوں تک سب لوگوں میں یہی جذبہ زیادہ پائیدار نظر آئے گا۔ ہر شخص اپنے طبقہ کے معیار کے مطابق عزّت

کے اسباب حاصل کرنے میں مصروف اور کوشاں نظر آئے گا۔ وہ اپنے طبقہ میں ذلت کی زندگی پر راضی ہونے سے گریز کرے گا۔ اور ان اسباب کے لئے کوشاں نظر آئے گا۔ جن سے وہ اپنے طبقہ میں صاحب اعتبار نظر آئے۔ اور جب اسے یہ اسباب پورے طور پر حاصل ہو جاتے ہیں تو اس طبقہ سے آگے بڑھ کر دوسرے طبقہ میں جا پہنچتا ہے اور پھر وہاں بھی جاہ طلبی کی کوشش شروع کر دیتا ہے جب تک وہ زمین پر زندگی کے سانس لیتا رہتا ہے اُس وقت تک لگاتار اس کی یہی رفتار رہتی ہے۔ کیونکہ انسانی کمال کی کوئی حد اور کوئی انتہا نہیں۔ لہذا انسان بڑے سے مرتبہ کو پہنچنے کے بعد بھی اپنے نفس کو یہ تسلی نہیں دے سکتا کہ میں کمال تک پہنچ گیا ہوں جس کے بعد مزید جد و جہد کرنے کی ضرورت نہیں۔

خداوند تعالیٰ کی قدرت بھی کیسی عجیب ہے کہ انسان کے دل میں عزّت کے متعلق اتنی خواہشات اور اتنا شوق بھر دیا ہے کہ وہ عزّت ہی کو اپنی زندگی کا پھل اور اپنی ہستی کا مقصد سمجھتا ہے اگر وہ عزّت کو حاصل نہ کر سکے یا اگر اسے عزّت مل جائے اور اس کے چھن جانے کا خطرہ ہو تو اُسے اپنی زندگی حقیر اور بے فائدہ معلوم ہونے لگتی ہے آپ نے کئی دفعہ ایسے گداگروں کو دیکھا ہو گا جنہیں تن ڈھانکنے کے لئے پرانے چیتھڑے ہی میسر ہوں گے۔ دنیا میں حیثیت اور عزّت کے اعتبار سے ان کا کوئی خاص درجہ نہیں مگر جب اُن پر کوئی شخص حملہ کرے یا کسی طرح انہیں ذلیل کرے تو اُن کو بھی غصّہ آجاتا ہے اور وہ اپنے درجہ کے مطابق اپنی عزّت کے بچاؤ کے

لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر موت تک کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں حالانکہ گالی یا ہتک نے نہ تو اُن کے کھانے پینے کی چیزوں میں کوئی کمی کی اور نہ انہیں مخملی گدیلوں کی بجائے فرشِ خاک پر سونے کے لئے مجبور کیا۔ مختلف اقوام اور مختلف قبائل کے ہزاروں افراد نے اپنی عزّت کو بچانے اور شرف و بزرگی کو طلب کرنے کی خاطر اپنی جان ہلاکت میں ڈالی ہے۔

اللہ کی شان بہت بڑی ہے دیکھئے انسان کو اس وقت تک کھانا پینا خوشگوار معلوم نہیں ہوتا نہ وہ چین سے سو سکتا ہے۔ جب تک اُسے یہ اطمینان حاصل نہ ہو جائے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت اس کا کھانا پینا زیادہ لذیذ اور اس کا بستر زیادہ نرم ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ اطمینان بھی حاصل ہو کہ اس کی اس خوش خوری اور زیب و زینت کا علم اس کے آس پاس کے لوگوں کو بھی ہے اور وہ اس کی برتری کے معترف ہیں۔ گویا اُس کے خیال میں نہ صرف سامانِ عیش و آرائش بلکہ خورد و نوش، لباس اور نکاح بھی فخر کرنے اور شیخی بگھارنے کا ذریعہ ہے۔ انسان کتنی جسمانی تھکان برداشت کرتا ہے۔ کتنے سفروں میں مشقّت اُٹھاتا، لڑائیوں میں شریک ہوتا اور قتل و غارت پر آمادہ ہو کر کتنی مرتبہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا اور عیش و آرام پر قادر ہونے کے باوجود طرح طرح کی مہمّیں شروع کر کے تکلیف اُٹھاتا ہے صرف اس لئے کہ اُسے شہرت حاصل ہو اور وہ فخر کا سامان مہیّا کر سکے اور جتنا درجہ اُسے قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے اُس

کو مٹنے یا کم ہونے سے بچا سکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اُس نے انسان کو عزت کی زندگی بسر کرنے کی محبت دی اور عزت کے سوا باقی سب چیزوں کو حصولِ عزت کا ذریعہ بنایا۔ یوں سمجھو کہ دُنیا کی زندگی ایک دشوار گزار راستہ ہے جو بزرگی اور عزت کی طرف جاتا ہے۔ انسان ساری عمر اس راستہ کو منزل بہ منزل طے کرتا ہے اور زندگی کی انتہا ہونے پر ہی اس راستہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ جتنا راستہ وہ طے کر چکا ہے اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور جتنا باقی رہ گیا ہو اُس کے لئے کفِ افسوس ملتا ہے۔

وہ عزت کیا ہے جس کیلئے انسان جد وجہد کو اتنا ضروری سمجھتا ہے۔ جس کی خاطر طرح طرح کے خطرات مول لیتا ہے اور بڑے بڑے ہنگاموں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی حیثیت ہے کہ جس کو حاصل ہو جائے اس کی سیادت کا اعتراف دوسرے لوگ کر لیتے ہیں۔ اس کی سربلندی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اس کی فرماں برداری کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔ یہ حیثیت جیسے اس شخص کو نمایاں کرتی ہے اسی طرح اس کی طرف منسوب ہونے والے سب افراد کو بھی خواہ وہ اس کے رشتے دار ہوں یا اس کے قبیلے کنبے والے یا دیگر ہم قوم لوگ سب کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس کی عزت کا اثر پہلے اپنے متعلقین پر ہوتا ہے اور پھر متعلقین کی آواز عام لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور پھر اس کا عام چرچا ہو جاتا ہے۔ اس حیثیت کو حاصل کرنے کے لئے جتنی تکالیف برداشت کی جاتی ہیں ان کا معاوضہ خداوند کریم کی طرف سے اسی چرچے اور شہرت کی شکل میں ملتا ہے۔ صاحبِ عزت جس بات میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں

برکت دیتا ہے اور یہ برکت اس کی ساری قوم پر تقسیم کر دیتا ہے۔ کتنی کمال کی حکمت ہے۔ جب قوم کا ایک فرد عزّت کا ایک منصب حاصل کر لیتا ہے تو باقی افراد کو بھی اپنی سیادت کا حصہ مل جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک فرد بھی اپنا درجہ اپنے ہم قوموں کی امداد سے ہی حاصل کرتا ہے۔ خداوند غالب و دانا کی کارسازی کا یہی انداز ہے اگر انسان کو اپنے ہم جماعت لوگوں میں سے مددگار نہ ملیں تو وہ اکیلا اپنی سعی کیا حاصل کر سکتا ہے۔ اور تنہا اس کی جدوجہد سے کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟

جس شخص کو عزّت اور سیادت کے جلیل القدر منصب پر فائز ہونا مطلوب ہو اس کا یہ فرض ہے کہ خود کو اور اپنے متعلقین کو ہر اُس کام کے حصول کے لئے تیار کرے جو فضیلت اور کمال سمجھا جاتا ہو اور حصولِ عزّت کے اس فطری جذبہ اور خداوندی الہام کے تقاضوں کو پورا کرنا اور اس کے فرائض کو سرانجام دینا ہے بڑا کٹھن کام عزّت کے اسباب میں سے چند ایک کو سامنے رکھ کر اس کی مشکلات کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ اس بلند مقام کو حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھانی پڑتی ہیں اور اس کے بعد بھی کامیابی کوئی ضروری امر نہیں۔ ان مشکلات کا مقابلہ امید اور حوصلہ کی مدد سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

اُمیّد کیا ہے؟ حوادث کی اندھیریوں میں چمکتی روشنی، مشقتوں کے سنسان جنگل میں تجربہ کار رہنما، مشکلات کے بے نام و نشان صحراؤں میں راہبری کا عَلَم، عزائم کو سستی سے بچانے والا غالب حاکم اور حکومتوں کو سکون و آرام کے بعد اُبھارنے

والا سپہ سالار، اُمید اس آرزو اور خواہش کا نام نہیں جو ذہن میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگر آرام کی زندگی گزارنے بستر راحت پر دن بھر پڑے رہنے اور اپنے پسندیدہ مقصد سے دُور لے جانے والے کھیلوں میں مشغول رہنے کے باوجود صرف زبان سے جُملے دہرائے جائیں کہ کاش میرا اتنا مال ہوتا! کاش میرا اتنا درجہ ہوتا تو اس کا نام اُمید ہرگز نہیں۔ ایسی خواہش اور آرزو رکھنے والے انسان کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ آسرا لگا کر بیٹھ جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شرافت یا سفلہ پن پر خاص مہربانی کرتے ہوئے ارتقائے انسانی کے لئے مقرّرہ قوانین تبدیل کر دیں گے اور محنت مشقّت کرنے سے پہلے پہلے اسے اپنی منزل مقصود تک پہنچا دیں گے ایسا ہونا ناممکن ہے۔

اُمید وہ توقّعات ہیں جن کے ساتھ عمل وابستہ ہو۔ جو اس وقت قائم کی جائیں جب اپنی طبیعت اور مرضی کے خلاف بھی نفس کو کام پر آمادہ کرنا پڑے۔ جب نفس کو مشقّتیں اور تکلیفیں برداشت کرنے کے لئے ریاضت کرائی گئی ہو۔ جب مصیبت کا مقابلہ صبر سے اور سختیوں کا مقابلہ شجاعت سے کرنا پڑے اور جب اُس افتاد کو برداشت کرنے میں کوئی تردد نہ ہو جو زندگی کے مقصد تک پہنچنے کے دوران میں پیش آجائے اور جب تک انسان کو یہ اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو کہ جب تک گوہر مقصود نہ ملے اس وقت تک زندگی ہی بیکار ہے۔ سچّے جوش عمل کے ساتھ مقصد کو حاصل کرنے والا مال خرچ کرنے میں کیا دریغ کریگا کہ مال کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ

حادثاتِ عالم کے صدموں سے زندگی کو بچایا جائے۔ وہ پہلے ہی مرحلہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیئے تیار رہے گا۔ جس طرح ترقّی کا جذبہ انسان میں ایک فطری جذبہ ہے۔ اسی طرح اُمیّد اور اپنی جدوجہد کے مقصد کو حاصل کرنے کا اعتماد بھی فطرت کی ایک امانت ہے یہ دونوں فطری امور ہر انسان کی طبیعت میں ودیعت ہوتے ہیں۔ اس لیئے افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ مزاحم ہونے سے باہمی کشمکش یا تصادم کی ایک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی فطری خواہش کے مطابق عزّت چاہتا ہے اور دوسرے کے دل میں اپنی وقعت کا سکّہ بٹھانے کا متمنّی ہوتا ہے گویا ہر شخص کی ذات خود ہی طالب اور خود ہی مطلوب ہوتی ہے۔ عقلِ انسانی نے ابھی تک کوئی ایسا اصول اختراع نہیں کیا جس کی رو سے ہر فرد کے لیئے ایک ایسا کام مقرّر ہو کہ سب با عزّت اور بزرگ بن جائیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی خواہشات اور اُمیّدیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ بہر حال انسان کی بڑائی اسی میں ہے کہ وہ اس تصادم سے بچ کر حصولِ عزّت کی جدوجہد جاری رکھے۔ جہادِ زندگی میں صبر و ضبط سے کام کرنے والوں کو بروئے کار لانے کے لیئے یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہترین تدبیر ہے۔ اس کے بعد بعض افراد یا بعض قومیں جب پے در پے مقابلے کر کے تھک جاتی ہیں تو ان کی ہمتّوں میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور جس طرح باقی سارے اخلاق غلط تربیّت سے بگڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان دو بہترین جذبوں میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے اور ہوتے ہوتے وہ نا اُمیدی اور یاس کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

اُمیدیں ختم کر کے یاس و قنوط کی زندگی بسر کرنے والوں کا حال کیا ہوتا ہے؟
وہ اپنی پستی کا فیصلہ خود صادر کر لیتے ہیں اور ہر ترقّی سے عاجز رہنے کی مُہر وہ اپنے اوپر آپ لگا لیتے ہیں۔ وہ کمینہ باتوں سے باز نہیں آتے۔ رذیل کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ ذلّت اور حقارت کی زندگی سے نفرت کرنے کی بجائے ہر قسم کی توہین برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیّار رکھتے ہیں۔ ان کے وُہ سارے جذبات اور احساسات ختم ہو جاتے ہیں جو انسان کے لیئے باقی حیوانات کے مقابلہ میں سرمایۂ امتیاز ہیں۔ حیوانوں کی طرح ان کو بھی صرف اپنے پیٹ اور شہوانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا خیال رہتا ہے اور ان کے پُورا ہونے پر ہی وُہ خوش رہتے ہیں۔

پھر کاش وہ جنگلی حیوانوں کی طرح بیکار پھرتے رہتے۔ نباتات کو چرتے اور ہری بھری چراگاہوں کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف روانہ ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ وہ حیوانوں کی طرح آزاد زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگرچہ انہوں نے اپنے لئے کام چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ان پر ایسے لوگ مسلّط کر دیئے جو انہیں دوسروں کے لئے کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں ان کی مثال ان خچّروں کی طرح ہے جو دن رات بوجھ اُٹھانے میں مصروف رہتے ہیں لیکن اپنی اٹھائی ہوئی چیزوں سے خود ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ ان کا کام یہی ہے کہ خود جدوجہد کر کے بدبختی کی زندگی گزار دیں۔ اور دوسروں کو آرام اور سعادت کا ذریعہ بنیں۔ وہ زراعت، صنعت اور دیگر اعمال میں لگے رہتے ہیں۔ کوئی شخص بھی اپنے لئے

اتنا سخت کام نہیں کرتا جتنا یہ لوگ دوسروں کے لئے کرتے ہیں۔ پھر بھی وہ لوگ اپنے کام سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ ان کے کام کا سارا فائدہ ان باہمت لوگوں کے ہاتھ آتا ہے جو ان پر حکومت کرتے ہیں۔

ذلیل آدمی کو اپنی ذلّت میں سختیاں اور مشکلات پیش آتی ہیں اگر وہ عزّت کی طلب میں ان کا ایک معمولی حصّہ بھی برداشت کرے تو اسے مطلوبہ عزّت بخوبی حاصل ہو سکتی ہے۔ ان ناامیدوں کا درجہ اپنے حاکموں کے سامنے باربردار جانوروں سے بھی گرا ہوا ہوتا ہے کیونکہ حاکم صاف طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے خود اپنا درجہ اس مقامِ بلند سے گرا دیا ہے جس کا حق انہیں فطری طور پر پہنچتا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ اپنے حقوق میں کمی کرتے کرتے وہ ایسے مقام پر رضامند ہو گئے ہیں جو بالکل ان کے شایانِ شان نہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانی شکل عطا کی اور دوسرے انسانی افراد میں جو فطری خوبیاں ہوتی ہیں ان سے انہیں بھی سرفراز کیا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے منصب کو بلند کرنے کے لئے خود ہی اس سے کوئی کام نہیں لیا۔ اور اسی لئے یہ حاکم ان سے پالتو جانوروں سے بھی ادنیٰ سلوک کرتے ہیں۔ ان قوموں کے حالات کا مشاہدہ جو ناامیدی کا شکار ہو کر اجنبی طاقتوں کے ہاتھوں میں گرفتار اور خوار ہو چکی ہیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس طرح کی کئی قومیں اب بھی موجود ہیں جن پر اُن کے آقاؤں نے پچھلے زمانوں میں بھی ظلم کئے اور اب بھی ان پر وہ ظلم ہوتے ہیں جو چوپایوں پر بھی روا نہیں رکھے جاتے۔

تعجب ہوتا ہے کہ جب اُمید اور طلب عزّت انسان کے فطری جذبات ہیں تو پھر انسان کا نفس کیونکر اتنا ذلیل ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی آس باقی نہیں رہتی؟ لیکن غور کرنے پر یہ تعجّب باقی نہیں رہتا۔ اس یاس اور نا اُمیدی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کا گمان یہ ہے کہ اس کے سارے اعمال صرف اس کی قدرت اور ارادے سے صادر ہوتے ہیں اور اس کے کاموں پر اس کی طاقت اور قوّت ہی کو کُلی اقتدار حاصل ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے ہاتھ کے اُوپر کوئی اور ایسا ہاتھ بھی ہے جو کبھی اس کی امداد کرتا ہے اور کبھی اسے جبراً روکتا ہے لیکن جب اُسے بار بار رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور مقصد تک پہنچنے کا راستہ اُس کے لئے بند ہو جاتا ہے تب اُسے پتہ چلتا ہے کہ میری طاقت بیکار اور میری قوّت کمزور ہے اُسے اپنی کمتری اور عجز و قصور کا شدید احساس ہو جاتا ہے اور اب وُہ یاس اور نا اُمیدی کا شکار ہو جاتا ہے اور ذلّت اور کمینہ پن اختیار کر لیتا ہے کیونکہ اس کا اعتقاد ہوتا ہے کہ جن رکاوٹوں کا ہٹانا اس کی اپنی طاقت سے باہر ہے۔ ان کو ہٹانے کے لئے اب اور کوئی ذریعہ اور سبب ہی نہیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر یاس اور نا اُمیدی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وُہ ابدی شقاوت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اگر اس کی قوّتِ ایمان مضبوط ہوتی اور اُسے یہ یقین حاصل ہوتا کہ اس عالم کا نظام کسی اور ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کی قدرت بہت بڑی ہے۔ جس کی عظمت کے سامنے ہر ایک طاقت عاجز و درماندہ ہے۔ جس کی جبارّیت کے آگے

ہر قسم کی سطوت اور زبردستی ہیچ ہے اور جس کے ہاتھ میں تمام کائنات کی باگ ڈور ہے۔ جس طرف کو چاہتا ہے اس کا رُخ تبدیل کرتا رہتا ہے۔ ایسے یقین کے ہوتے ہوئے اس پر ناامیدی اور قنوطیت کی بلاؤں کا غالب آجانا ناممکن تھا۔ عزم و یقین رکھنے والا انسان اگرچہ اپنی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی ہر طاقت پر غالب آنے والی طاقت کا غلبہ اس کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اعمال میں اس کی طرف مائل رہتا ہے اور اس کے چہرے پر یاس و ناامیدی کے آثار ایک لمحہ بھر کے لئے بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ جوں جوں مصائب اور سختیاں بڑھتی ہیں اس کی ہمت ان کی مدافعت کے لئے قوی تر ہوتی جاتی ہے اس کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان سارے شدائد پر غالب ہے۔ اس کے سامنے جب کبھی ایک راستہ بند ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس پر بھروسہ کے کئی اور دروازے اس کے لئے کُھل جاتے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے۔ نہ اُکتاتا ہے۔ اور نہ اس کے حوصلے پست ہوتے ہیں۔ اس کا مضبوط عقیدہ ہوتا ہے کہ کائنات کی تدبیر کرنے والی ہستی غلبہ اور طاقت والوں کو مغلوب کرکے کمزوروں کے سپرد کر سکتی ہے۔ وہ ہستی جو پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہے اور سمندروں میں خشکی کی لہریں پیدا کر سکتی ہے۔ ضعیف و ناتواں افراد کو طاقتوروں پر حاکم بنا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ کرشمے بارہا ظاہر ہو چکے ہیں اور ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اس عقیدے کی بنا پر اس کی عزیمت مضبوط ہوتی ہے اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ

کی طرف سے عائد کردہ فرائض یعنی حصولِ کمال کے لیے مسلسل جد و جہد کرکے دنیا اور آخرت کی ان سعادتوں کو حاصل کر لیتا ہے جو خداوند تعالیٰ نے اس میں ودیعت کی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت، اس کے غلبہ اور اس کی شوکت وسطوت پر یقین کرنے والا انسان کبھی یاس و قنوط کا شکار ہو نہیں سکتا۔ اس شک و شبہ سے مبرا حقیقت کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے نبیوں کی زبانی دی۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا تھا۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ[1] اور حضرت ابراہیم کا ارشاد ہے وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ[2] یہ دونوں اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان آیتوں میں بتاتا ہے کہ یاس اور قنوط کفر و انکار کی علامتیں ہیں۔ اور سچ ہے کہ جس دل میں اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی قدرتِ کاملہ کا عقیدہ راسخ ہو گیا وہاں نا اُمیدی کو راستہ مل بھی کیسے سکتا ہے؟

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ پر جو یقین اور نبی کریم حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پیغام کی سچائی پر جو اطمینان ہے وہ انہیں ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود اپنی گزری ہوئی شان و شوکت کے دوبارہ حصول سے نا اُمید ہوں۔ ان کا ایمان کبھی ان کے لئے یہ جائز نہیں سمجھتا کہ وہ ذلت اور ظلم پر راضی ہو جائیں اور اپنا وقار بلند کرنے میں سستی سے کام لیں۔ خصوصاً جب

---

[1] بیشک اللہ کی رحمت سے وہی نا اُمید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

[2] گمراہوں کے سوا اور کون ہے جو اپنے رب کی رحمت سے نا اُمید ہوتے ہیں۔

کہ وُہ ابھی تک ایسی اکثر ذلتوں سے بچے ہوئے ہیں جن کا شکار دنیا کی بہت سی قوموں کو ہونا پڑا - ان کے بہت سے شہنشاہ ابھی مسند حکومت پر رونق افروز ہیں اور روئے زمین کا ایک وسیع خطہ ان کے قبضہ میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے دروازے مسلمانوں پر کھلے ہوئے ہیں اور ان کے لئے صرف ان دروازوں میں داخل ہونے کی دیر ہے - اللہ تعالیٰ کی نعمت ہاتھ پھیلا پھیلا کر ان کو اپنی طرف بلا رہی ہے - غفلت میں مست پڑنے والوں کو جھنجھوڑ کر اور سونے والوں کو جگا کر ان سے اُٹھ کھڑے ہونے کا مطالبہ کر رہی ہے - اپنے پچھلے وقار کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے انہیں صرف اتفاق اور تعاون کرنے کی ضرورت ہے - باہمی دینی روابط کے مستحکم ہوتے ہوئے اتفاق اور تعاون کا حاصل ہونا ان کے لئے سہل ترین کام ہے - پھر یاس و ناامیدی اور قنوط و بے اطمینانی کی موجب کونسی چیز ہے - اللہ تعالیٰ کی کتاب کا ناطق فیصلہ تو یہ ہے کہ ناامیدی گم کردہ راہ لوگوں کی علامت ہے - پھر کیا رشد و ہدایت اور گمراہی و ضلالت کے درمیان کوئی اور برزخ بھی پایا جاسکتا ہے ؟ ہرگز نہیں اَفَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ[1] - قنوط اور ناامیدی کا شکار ہونے والوں کو کیا عذر ہو سکتا ہے ؟ کیا وُہ اپنی سیادت کے زمانہ کو یاد کرتے ہوئے اب اجنبی طاقتوں کی بندگی پر راضی رہیں گے - کیا ایسی زندگی کو حاصل کر کے وہ اطمینان اور خوشی چاہتے ہیں -

---

[1] حق کے بعد گمراہی کے علاوہ اور کیا ہے -

جو ذلّت و خواری احتیاج فاقہ اور دائمی شقاوت کے عذاب سے بھرپور ہو؟ کیا وہ اجنبی حاکموں، بغض سے بھرے ہوئے مسرور دشمنوں، پھبتیاں اُڑانے والے کمینوں، برائیاں بیان کرنے والے فریب کاروں، اور عار دلانے والے خسیسوں کے زیر اقتدار رہ کر اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں؟ کیا وہ ان دشمنوں کے طعنے کُھلے دل سے سُن سکتے ہیں جو انہیں اس قدر بوسیدہ اور اس قدر کمزور بتاتے ہیں کہ ان کا کسی شمار و قطار میں آنے والی قوم ہونا محال سمجھتے ہیں؟ اگر انسان انسانیت سے بالکل عاری نہ ہوا ہو تو اُس کے لئے ان کدورتوں اور تلخیوں سے معمور زندگی میں چند لمحے بسر کرنا بھی ناممکن ہے۔ کیا یہ نااُمید قوم زمین میں اپنی مسلّم ہستی کو بھول جائے گی؟ ابھی اس کی سلطنت پر کوئی لمبا عرصہ نہیں گزرا۔ نہ اس کی تاریخ مٹی ہے اور نہ اس کی نشانیاں ختم ہوئی ہیں۔ روئے زمین پر مسلمانوں کی شوکت و سطوت کے نقوش ابھی تک اسی طرح قائم اور روشن ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے ہیں ان کو بجا آوری میں کوتاہی عوام اگر کریں تو کریں مگر شریعت کی مہارت کا دعویٰ کرتے ہوئے علماء کے پاس کیا عذر ہو سکتا ہے؟ وہ کیوں مسلمانوں کی متفرق طاقتوں کو اکٹھا کرنے کے لئے جد و جہد نہیں کرتے اور کیوں ان کی مختلف مساعی کو مجتمع کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے آپس کے بگڑے ہوئے تعلقات کو سنوارنے میں کیوں سرگرمی نہیں دکھلاتے۔ مسلمانوں کی اُمیدوں کو مضبوط کرنے۔ ان کو رحمت الٰہی کا مژدہ دینے اور اللہ تعالےٰ کے وعدوں

کو یاد دلانے میں کیوں اپنی طاقت صرف نہیں کرتے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر یقین کرتے اور سچے دل سے اس کی عبادت بجالاتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے وعدے کبھی غلط ثابت نہیں ہوتے۔

اس وقت ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کے دل میں صورتِ حال کا پورا پورا احساس موجود ہے اور وہ ان فرائض کو بجالانے کے لئے زمین کے مختلف حصّوں میں مصروفِ عمل ہو گیا ہے۔ مگر ہم باقی مسلمانوں سے بھی یہ اُمّید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ اتّفاق کریں گے اور ان کی امداد و اعانت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی امداد سب کے شامل حال رہے گی۔ ان تنصروا اللّٰہ ینصرکم و یثبّت اقدامکم (اگر تم مدد کرو گے اللہ کی تو وہ تمہاری مدد کریگا۔ اور تمہارے پاؤں جمادے گا)۔

عمائدِ سلطنت

یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر قد بینا لکم الایات ان کنتم تعقلون۔

(اے ایمان والو۔ اپنے سوا کسی کو اپنا رازدار مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ تمہاری مضرت کی تمنّا رکھتے ہیں۔ واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے ہم علامات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے۔ اگر تم عقل سلیم رکھتے ہو)

لوگ کہتے ہیں کہ ملکوں کی حفاظت اور سلطنت کی رکھوالی مستحکم فصیلوں مضبوط قلعوں، سرگرم کار عساکر، لاتعداد سازوسامان حرب، عمدہ اور قابلِ تعریف ہتھیاروں سے ہوتی ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ سلطنتوں کے بچاؤ کے لئے ان ذرائع سے کام لینا نہایت ضروری ہے مگر یہ کام یہ آلات خود بخود نہیں بجا لاتے۔ ان سے حفاظت اور بچاؤ کا کام اُسی وقت لیا جا سکتا ہے جب ان کو استعمال کرنے کے لئے تجربہ کار اور سوجھ بوجھ والے افراد میسّر ہوں جو ان آلات کو امن کے زمانے میں بار بار ملاحظہ کر کے درست کرتے رہیں اور ضرورت کے وقت اپنے مقصد کے

لئے اچھی طرح استعمال کر سکیں۔

پھر اگر ان کاموں کے لئے ایسے افراد موجود ہوں۔ تب بھی یہ ملکی حفاظت کے لئے کافی نہیں۔ جب تک کچھ اصحابِ فکر و تدبیر اور اربابِ عقل و تجربہ سے آشنا نہ ہوں جو ملک کے باقی کاموں کو چلانے کی ذمہ داری لے کر امن کے سامان مہیا کریں جو سلطنت کی عمارت عدل کی بنیادوں پر استوار کریں اور جو شریعت کی حدود اور احکام کی نگرانی کریں۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے اجنبی ممالک کے ساتھ اپنی مملکت کے تعلقات کی نگرانی بھی کرتے رہیں۔ اور صحت مند سیاست کی بنیاد رکھ کر ملک کو اس بلند ترین مرتبہ پر پہنچائیں جو اس کے شایانِ شان ہو۔

ان بلند ترین کارناموں کو سرانجام دینے والے افراد کے لئے ضروری ہے کہ ان کے دل سلطنت کی محبت سے معمور اور رعایا کے ساتھ شفقت اور مہربانی کے جذبے سے بھرپور ہوں۔ ان کے نفوس میں حمیت کا جذبہ مضبوط اور غالب ہو۔ ان کے سینوں میں وہ حرارت موجود ہو جو فرائض پر آمادہ کرے اور نامناسب اعمال سے روکے۔ جب کبھی سلطنت کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچے یا انہیں کوئی خطرہ درپیش ہو تو ان لوگوں کو دلی تکلیف پہنچے۔ ان بلند اور پسندیدہ اوصاف سے متصف ہو کر ہی وہ اپنے فرائض و اشغال کو بجا طور پر ادا کرنے اور ان کو نقصان سے بچانے پر قادر ہو سکیں گے۔ وہ نقصان جو تھوڑا ہو کر بھی سلطنت میں برا بگاڑ پیدا کر سکتا ہے۔ ایسی ہی خصلتوں کے مالک افراد صحیح معنوں میں قوم کہلا سکتے ہیں

حاکم کسی جماعت سے بھی تعلق رکھتا ہو وہ زرِ کثیر صرف کر کے لاؤ لشکر اکٹھا کر سکتا ہے اور ہر قسم کے عساکر کی تعداد کو بڑھا سکتا ہے مگر اُسے وہ بہترین معتمد اور مخلص ارکانِ دولت جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا، وہ سمجھدار، ہمدرد، غیرتمند اور برگزیدہ افراد جو ملک کی ضروریات کا اہتمام اسی جوش وخروش سے کرتے ہیں جس طرح وہ اپنی ضروریات کا اہتمام کرتے ہیں محض روپیہ خرچ کر کے میسر نہیں آ سکتے۔

اس مہتمم بالشان امر کے بارے میں فطرت کے قانون اور طبعی قواعد کی پیروی سے ہی کام چلے گا۔ طبعی قواعد کی پیروی ذہن کو غلطی سے بچا کر نازک اور گہرے رازوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جو شخص ناموسِ طبعی کو راہبر بناتا ہے اور اس کے دکھلائے ہوئے راستے پر قدم بہ قدم چلتا ہے وہ بہت کم رائے کی غلطی یا بے راہ روی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہوشمند آدمی اس قسم کی کُلّی اور جزئی غلطیوں کا جائزہ لے جو آج تک عالمِ انسانی میں واقع ہوئی ہیں اور ان کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کرے تو وہ صرف اس نتیجے پر پہنچے گا کہ قانونِ فطرت سے کنارہ کشی اور کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنّتِ جاریہ کے مطابق عمل سے انحراف اس کا بنیادی سبب ہے

قانونِ فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سلطنت اور رعایا کے بارے میں شفقت مہربانی، حمیّت اور غیرت صرف انہی لوگوں کا حصّہ ہے۔ جن کا خاندانی رشتہ قوم کے ساتھ مضبوط اور برادرانہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ خاصیّت

رکھی ہے کہ جو شخص قوم کے ساتھ جنسیت اور مسلک کے رشتے میں مربوط ہو وہ قوم
کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں اور تعلق کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اس لئے اس تعلق
میں اُس کے ساتھ جتنے لوگ بھی مربوط ہیں ان سب کی طرف سے وہ ذلّت
اور ظلم کی مدافعت اسی طرح کرتا ہے۔ جس طرح اپنے گھر اور اپنی جاگیر کی کرتا ہے۔

تم نے بارہا مشاہدہ کیا ہوگا کہ کس طرح ایک علاقہ والے دوسرے علاقہ
والوں کا ذکر برائی کے ساتھ کرتے ہیں اور بلا کسی استثناء کے ان کی خصلت اور
مذہب پر گرفت کیا کرتے ہیں۔ ایک شامی مصریوں پر تنقید کریگا اور ایک مصری
شامیوں کی نکتہ چینی میں مصروف رہے گا۔ ذرا اپنے ذہن کو یکسو کرکے اس پر غور
کرو تو اس کی وجہ یہی نظر آئے گی کہ قومیت کے اشتراک کی وجہ سے مصری کو صرف
مصریوں سے اور شامی کو صرف شامیوں سے محبت ہے۔

جنسی اشتراک کی وجہ سے رحمت و شفقت کا فطری جذبہ پیدا ہوتا ہے
اور قوم کا ہر فرد اس بات کا احساس کرتا ہے کہ قوم جن فوائد کو حاصل کرے گی ان
میں خود اُس کا حصّہ بھی ضرور ہے یا قوم پر جو مصیبتیں آئیں گی ان کے اثرات سے
وہ بھی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ اور اگر اس فرد کے ذمّے قوم کے مہتم بالشان امور
کا انصرام ہو تو قومی منافع اور مصائب میں اس کا شدید احساس اور بھی شدید اور
قوی تر ہوتا ہے۔

اسی لئے ہر سلطنت کے مختار کل حاکم کا یہ فرض ہے کہ وہ اُمور سلطنت صرف

دو قسم کے آدمیوں کے سپرد کرے۔ وہ شخص جسکے ساتھ حاکم کا نسلی رشتہ مضبوط ہو جس میں کمزوری اور انقطاع کا امکان نہ ہو۔ اور جس کا سب رشتہ دار اور ہم جنس پورا پورا احترام کرتے ہوں تاکہ اس عزّت و احترام کی وجہ سے سارے افراد اپنی نسل اور خاندان کو ہر عیب اور برائی سے بچانے کے لئے تہ دل سے کوشاں ہوں اور ان کے تعلّقات مسالک مذہب اور دین کے اختلاف کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو سکیں یا کام ایسے شخص کے حوالہ کرنا چاہئے جسے صاحب سلطنت سے اتنا گہرا تعلق ہو کہ وہ مضبوطی اور استواری میں خاندانی رشتے کا قائم مقام ہو بلکہ دلوں میں اُس کی قدر و منزلت خاندانی رشتہ کی قدر و منزلت سے بھی بڑھ چڑھ کر ہو۔ جیسے اسلام جسے مسلمان ہر جنسی تعلق اور رشتہ پر افضل و برتر سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور قبیلوں پر اس کا اثر یکساں ہے۔ اس قسم کے اشخاص اس لئے کارآمد ثابت ہوں گے کہ ملکی حمیّت و ہمدردی اور سلطنت کے لئے غیرت کے مبادی و مناشی انہی دو رشتوں پر منحصر ہیں۔

رہے وہ اجنبی اشخاص جو صاحب مملکت کے ساتھ نہ جنس میں شریک ہوں اور نہ ایسا مضبوط مذہبی علاقہ رکھتے ہوں جو جنسیت کا قائم مقام ہو سکے سو ان کی مثال سلطنت میں اُس مزدور کی طرح ہو گی جو اُجرت پر گھر کی تعمیر میں مصروف ہے اسے تو اپنی اُجرت سے غرض ہو گی۔ اپنے پیسے کھرے کرنے کے بعد وہ اس بات سے بے تعلق ہے کہ گھر سلامت رہتا ہے یا سیلاب اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچاتا ہے یا زلزلوں سے اس کی دیواریں گرتی ہیں۔

جس مزدور کی حالت یہ ہو کہ جس قوم کی وہ خدمت کر رہا ہے اس کے شرف اور بزرگی سے اس کی اپنی بزرگی اور اُس کی ذلّت و رسوائی سے اپنی ذلّت کا احساس وابستہ نہ ہو وہ اس قوم سے بالکل الگ تھلگ ہو اور جونہی اس کی معیشت کے سامان وہاں ختم ہوں وہ اپنے اصلی مسکن کی طرف لوٹ جائے۔ ایسے مزدور کی طبیعت میں وہ جذبہ کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو اُسے ملک کی فلاح و بہبود کو نقصان پہنچانے والے اسباب سے احتراز اور نفع بخش اسباب کی طلب و خواہش پر آمادہ کرے اس کے دل میں وہ امنگیں پیدا ہی نہیں ہو سکتیں جو اُسے ملک کے مفاد کو برقرار رکھنے والے امور کے متعلّق غور و فکر پر آمادہ کر سکیں۔

اب ان اجنبیوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار تم خود ہی کرو جو فقر و فاقہ سے تنگ آ کر اپنا ملک چھوڑ چکے ہیں۔ اور ہر ممکن طریقے سے روزی کمانے کی خاطر دوسرے ملکوں کی سیاحت میں مصروف ہیں۔ ان کے لئے اپنا سامانِ معیشت مہیّا کرنے میں سچّائی، جھوٹ وفاداری اور بے وفائی سب یکساں ہیں۔ وہ وعدے کی استواری اور خیانت میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اور اپنی روزی کمانے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے دوسرے مقاصد کو سرانجام دینے میں بھی منہمک ہیں۔ جن ممالک میں انہیں ملازمتیں ملتی ہیں انہی ممالک پر اپنی قوموں کی سیادت اور تصرّف کو مضبوط کرنے کے لئے راستے ہموار کرتے ہیں۔ ممالکِ اسلامیّہ میں جو اجنبی افراد ملازمت کر رہے ہیں ان کی یہی حالت ہے۔ ان کے دلوں میں سچائی اور امانت کا کوئی

جذبہ نہیں۔ ہاں دھوکے اور خیانت کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

بیشک جس طرح بعض اخلاق اور فطری خصلتوں میں خارجی عوارض سے تبدیلی اور فساد پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بعض مذاہب کے پیروؤں اور قوم کے افراد میں بھی کمزوری اور فتور پیدا ہوجاتا ہے۔ قوم کے بڑے بڑے کارکن جب دیکھتے ہیں کہ صاحب سلطنت ان کی خدمات کی قدر نہیں کر رہا ہے تو وہ سلطنت کے کاروبار میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں خود غرضی بیدار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مخصوص منافع کو فرائض عامّہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح قوم کے نظام میں خلل پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس بے اعتنائی سے قوم کو جو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے وہ اس نقصان سے کہیں کم ہے جو سلطنت کے مہتم بالشان امور میں اجنبیوں کے دخیل ہونے سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی تلافی بھی بہت آسان ہے کیونکہ قوم کے اپنے فرد کے اخلاق خراب بھی ہوجائیں تب بھی قوم کے ساتھ اس کا فطری تعلق اور جبلّی ہمدردی یکسر زائل نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنے فریضہ کے بجالانے میں ایک دو مرتبہ بددیانتی بھی کرے تب بھی دینی یا جنسی تعلق کا جذبہ اس کے ضمیر کی پکار بن کر اُس کی سوئی ہوئی فطرت کو جگائے گا اور آخرکار وُہ ایک دفعہ پھر تندہی اور ایمانداری سے کام میں مصروف نظر آئے گا۔ اس کے دل کے ساتھ دین اور جنسیت کا جو مضبوط تعلق قائم ہے وُہ اسے وقتاً فوقتاً ان کی رعایت کرنے اور ان کی طرف توجہ دینے پر آمادہ کرے گا اور اپنے ہم جنس اور ہم مذہب لوگوں

کے ساتھ خواہ وہ کتنے ہی دُور کیوں نہ ہوں، اُسے ہمدردی پر مائل کریگا۔

اس لئے ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم مشرق کے فرمانرواؤں پر عموماً اور مسلمان حکمرانوں پر خصوصاً زیادہ سے زیادہ افسوس کریں۔ ان لوگوں نے اپنے ممالک کے جملہ امور اور اشغالِ سلطنت اِن لوگوں کے سپرد کئے جو ان سے بالکل اجنبی ہیں، نہ صرف یہ بلکہ اجنبی افراد کے ساتھ دوستی اور آشتی کا پیوند اتنا مضبوط کیا اور انہیں اتنا قابلِ اعتماد تصوّر کیا کہ اپنے گھریلو کاروبار بھی ان کے تصرّف میں دے دیئے۔ بلکہ اپنے ممالک کے قبضہ سے بھی ان کے حق میں دستبردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ ان اجنبیوں کی چشم آز کتنی کھُلی ہوئی ہے اور ان کو یہ معلوم ہے کہ مدّتوں سے ان کے درمیان بغض و عناد کے واقعات ہوتے چلے آئے ہیں۔ ان کو تجربہ نے یہ بتلا دیا ہے کہ ان اجنبیوں کو جب کبھی امانت سپرد ہوئی ہے انہوں نے اسی میں خیانت کی ہے۔ جب کبھی ان کی عزّت کی گئی ہے انہوں نے اپنے میزبانوں کو ذلیل کیا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ احسان کا مقابلہ بُرائی سے، توقیر کا حقارت سے اور انعام کا کفرانِ سے کرتے ہیں۔ تم ان کو کھلاؤ پلاؤ وہ تمہیں آنکھیں دکھائیں گے۔ تم ان کے قریب جاؤ وہ کنارہ کشی کریں گے۔ تم ان سے تعلّقات استوار کرو۔ وہ بے وفائی کریں گے۔ تم ان پر اعتماد کرو وہ دھوکا دیں گے۔ کیا مشرق کے حکمرانوں کے لئے اب بھی وقت نہیں آیا کہ وہ ان تجربات سے سبق لیں جو انہیں حوادث نے سکھلائے اور ان احکام خداوندی کی پیروی

کریں جو کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ کیا یہ ان کا فریضہ نہیں کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے اور اپنے دشمن کے ہاتھوں تباہ کرنے سے باز آئیں۔

اے امرائے عظّام! تمہارا ان اجنبیوں سے کیا واسطہ ؟ ھا انتم اولاء تحبونهم ولا یحبونکم[1] تم نے ان کے حالات کو جان لیا اور تمہیں ان کے منافق ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا (ان تمسسکم حسنة تسؤهم وان تصبکم سیئة یفرحوا بها[2]) پھر ان سے دور کیوں نہیں بھاگتے۔ اپنے ہم وطن بھائیوں کی طرف اور اپنے دین اور ملّت کے رشتہ داروں کے گروہ میں دوڑ کر کیوں نہیں آجاتے؟ آؤ۔ غیروں کے پاس تم محبّت اور قربانی کا جتنا جذبہ لے کر جاتے ہو اُس کا ایک معمولی حصّہ لے کر اپنے بھائیوں کی طرف رُخ کرو۔ وہاں سے تمہیں بہترین امداد و اعانت مل جائے گی۔ اللہ تعالےٰ نے عام انسانوں کو اور خود تم کو جو جذبات فطری طور پر عطا کئے ہیں اور تمہارے ضمیر کی آواز تمہیں جس طرف پکار رہی ہے اس کے پیش نظر قانونِ الٰہی کی پیروی کرو۔ اوامر و نواہی میں اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا خیال کرو تو گمراہی اور ضلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے سے بچ جاؤ گے۔ کیا ابھی تک تمہیں سمجھ نہیں آئی؟ کیا ابھی تک تم میں احساس پیدا نہیں ہوا؟ کیا ابھی تک تجربہ میں پختگی پیدا نہیں ہوئی؟ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

---

[1] ہاں تم ایسے ہو کہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہو جو تم سے محبت نہیں رکھتے۔

[2] اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو ان کے لئے موجب رنج ہوتا ہے اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

اپنے بیگانے

وما ظلمھم اللہ ولکن کانوا انفسھم یظلمون - (اللہ تعالیٰ نے ان پر زیادتی نہیں کی تھی بلکہ وہ خود اپنے آپ پر زیادتی کرتے تھے -

جس قوم کا اپنے معاملات کے حل و عقد میں کوئی اختیار نہ ہو - ملّی و ملکی امور کے بارے میں اس سے کوئی مشورہ نہ لیا جائے - اپنے عمومی فائدوں کی خاطر اُس کے ارادے بیکار اور بے نتیجہ اور اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو اور اُسے ایک ہی مستبد حاکم کے سامنے جھکنا پڑے اور اس حاکم کا ارادہ ہی قانون متصوّر ہو - اس کی خواہش پر ہی نظام حکومت کا دار و مدار ہو - جو اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کیا کرے - اور من مانی کارروائیاں کرنے میں مطلق العنان ہو - ایسی قوم کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی - نہ اس کی رفتارِ ترقی کسی قانون اور نظام کے ماتحت منظم ہو سکتی ہے - وہ سعادت اور شقاوت، علم اور جہالت، دولت اور فاقہ کشی اور عزت اور ذلت کی کشمکش میں کبھی تنزل اور کبھی ترقی سے دوچار رہتی ہے -

قوم کے تمام اچھے یا بُرے حالات کا انحصار حکمران ہوتا ہے - اگر حاکم صاحب رائے، بلند حوصلہ، اور سلیم الطبع ہو تو قومی سیاست کی تدبیر میں عدل سے کام لیتا ہے - علم کی عمارت کو بلندی تک پہنچا دیتا ہے - مختلف صنعتوں کے

دروازے کھول دیتا ہے اور ان میں مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے عوام میں عزت اور خودداری کی روح پھونک کر انہیں شجاعت، بہادری، غیرت اور عزتِ نفس جیسے بہترین فضائل کے زیور سے آراستہ ہونے پر آمادہ کرتا ہے اور عزت کے ایک بلند مقام پر پہنچا کر ان کے لئے راحت اور آرام کے راستے ہموار کر کے انہیں ہر ممکن طریقے سے بھلائی اور خیر کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیتا ہے۔

لیکن اگر قوم کا حاکم جاہل، بداخلاق، پست ہمت، کم حوصلہ، بزدل، بیوقوف خسیس اور کج رو ہو تو وہ اپنے تصرف اور تدبیر سے قوم کو نقصان کے گڑھوں میں گرائے گا۔ اس کی آنکھوں پر جہالت کے پردے ڈال دے گا اور اسے فقر وفاقہ میں مبتلا کر دے گا۔ تسلط اور اقتدار پسندی میں عدل کی شاہراہ سے ہٹ جائے گا۔ اور سرکشی کے مختلف دروازے کھول دے گا۔ ایسی حکومت میں قوی اور طاقت ور رعایا کمزور ہو جائے گی۔ نظام بگڑ جائے گا۔ اور اخلاق فاسد ہو جائیں گے۔ قومی آواز کمزور ہو جائے گی اور عوام پر ہر وقت یاس و ناامیدی چھائی رہے گی۔ ایسے حالات میں غرض مند سلطنتوں کی للچائی ہوئی نظریں قوم پر پڑنے لگتی ہیں۔

اگر ایسے وقت قوم کے اندر زندگی کی بقا باقی ہو اور مشیتِ الٰہی میں اس کے لئے خیر و برکت لکھی ہو تو عوام میں سے چند اصحابِ رائے اور اربابِ ہمت اٹھ کر اس زہریلے پودے کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں اور پیشتر اس کے کہ اس کے زہریلے اثرات پوری قوم میں پھیلیں وہ لوگ اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس کے

غرض وہ اپنے مقاصد کیلئے پاکیزہ اصولوں کا پودا لگا دیتے ہیں۔ جو تمام آفات سے محفوظ رہ سکے اور اگر قوم اس درجہ سے نیچے گر جائے اور اپنے امور کو اس بیوقوف اور ظالم حاکم کے ہاتھ میں دے کر اُسے من مانی کارروائیاں کرنے کا اختیار دے دے تو وہ اُسے غلامی کی ذلّت میں مبتلا کر کے اسے دیگر اقوام میں رسوا کر دے گا اور یہ سب کچھ قوم کی اپنی بے عملی اور سستی کا نتیجہ ہو گا۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

تمہارا رب بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔)

ہندوستانی نیچری

انگریز ہندوستان میں وارد ہوئے تو یہاں کے بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ انہوں نے وہ کھیل کھیلا جس کو دیکھ کر ذی ہوش اصحاب کبھی ہنستے اور کبھی روتے ہیں وہ ہندوستان کے اندرونی حصّوں کو چیر کر آگے بڑھتے رہے اور اس کے کئی علاقے قبضہ میں لے لئے۔ جب کبھی کسی خطّے پر قبضہ کرتے وہاں کے باشندوں پر احسان جتاتے اور وہاں کے قبضے اور سکونت سے بے غرضی و بے تعلّقی کا اظہار کرکے کہتے "ہم تو صرف تجارتی کاروبار میں دلچسپی لینا چاہتے ہیں۔ حکمرانی اور سیاست ہمارا اصل مشغلہ نہیں۔ ان اہم فرائض کا بوجھ اُٹھانے پر ہم صرف اس لئے آمادہ ہوئے ہیں کہ ہمیں ان بادشاہوں اور نوابوں کے ساتھ ہمدردی ہے جو اپنے ممالک کی تدبیر اور انتظام کرنے سے عاجز ہیں۔ جب کسی بادشاہ یا نواب کو اپنے ملک کے انتظام میں دشواری محسوس نہ ہوگی ہم چلے جائیں گے۔ ہمارے سامنے اور بہت سے اہم کاروبار ہیں جنہیں صرف بنی نوع انسان کی ہمدردی کے خیال سے ہم نے چھوڑ رکھا ہے۔"

اسی طرح دوسری طرف انگریزوں نے ہر صاحب ریاست کو یہ سمجھایا کہ ریاست کا انتظام کرنے سے خواہ مخواہ بدنی اور ذہنی کوفت سے دوچار ہونا

پڑتا ہے - اس لئے صاحب مملکت کے لئے یہی بہتر ہو گا کہ وہ آرام کرے تاکہ تدبیر مملکت کی مشقّت سے اس کی گلو خلاصی ہو - اس کے لئے اگر اُسے فقر اور ذلّت کی موت مرنا پڑے تو بھی کچھ حرج نہیں - گویا انگریزوں کا اصول یہ ہے کہ جب تک دنیوی اور اُخروی مشاغل کا اثر بدن اور ذہن پر پڑتا رہے گا، وہ اس ملک پر مسلّط رہیں گے اور جب وہ وقت آئے گا کہ دنیوی اور اُخروی مشاغل کا اثر بدن اور ذہن پر کچھ نہیں پڑے گا (یعنی جب قیامت قائم ہو گی) اس وقت وہ ملک کو فوراً چھوڑ دیں گے - آج مصر میں بھی ان کا یہی نعرہ ہے -

جب انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہوئے سلطنتِ مغلیہ کے نقش و نگار مٹ گئے تو انہوں نے ملک کا ایک گہرا جائزہ لیا اور دیکھا کہ یہاں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے اور ہر ایک کا دل اپنی سلطنتِ عظمیٰ کے ختم ہونے کی وجہ سے زخمی ہے اور ان کا تعلّق مشرق و مغرب کے کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ قائم ہے ان کو یہ بھی علم تھا کہ مسلمان جب تک اپنے دین پر قائم ہیں۔ اور جب تک وُہ قرآن پڑھتے اور سُنتے ہیں اُس وقت تک کسی اجنبی طاقت کے آگے ان کا جھکنا محال ہے اور اجنبی بھی وہ جس نے محبّت اور دوستی کی آڑ میں دھوکے سے ان کی عظیم الشان سلطنت پر قبضہ کیا ہو - اس لئے انہوں نے اسلامی اعتقادات کو کمزور کرنے کے لئے ہر ممکن وسیلہ سے امداد دینی شروع کی۔ اپنے پادریوں اور روحانی پیشواؤں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کتابیں لکھیں اور

رسالے جاری کریں اور دل کھول کر مذہب اسلام پر اعتراضات کریں - اور صاحب شریعت (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر ناروا الزام لگائیں (برأہ اللہ ممّا قالوا) اس قبیح کارروائی میں وہ حد درجہ قابلِ نفرت کارنامے کر گزرے - کوئی غیرت مند انسان تو ایسی سرزمین میں ٹھیرنا بھی گوارا نہیں کرے گا جہاں ایسے رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہوں - ان باتوں سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اعتقادات میں ضعف پیدا کر کے انہیں انگریزوں کا مذہب قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے ایک طرف ان کی یہ کارروائیاں جاری تھیں - دوسری طرف اُنہوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے اور انہیں اپنے تشدّد اور قوّت کے ذریعہ دبا کر ضرر پہنچانے کی انتہائی کوششیں کیں - عام ملازمتوں سے ان کو الگ کر دیا - مسجدوں اور مدارس کے اوقاف ضبط کر لئے اور ان کے علما اور اکابر کو جلاوطن کر کے کالے پانی بھیج دیا - وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے دین سے ہٹانا ویسے تو ناممکن ہے اسی طرح انہیں دین سے غافل کیا جائے اس کے لئے اگر ایک طریقہ ناکام رہا تو دوسرا اختیار کیا گیا اور اس کے کامیاب ہونے میں کچھ تاخیر ہو تو تیسرا - غرض ہر قیمت پر وہ مسلمانوں کو تباہ اور کمزور کرنے کے درپے تھے - کیونکہ دراصل انگریز کو خطرہ ہندوستان میں مسلمانوں سے ہی ہے - مُلک انہی سے چھینا گیا ہے اور حق انہی کا غصب ہوا ہے -

اتفاقاً ہندوستان کا ایک آدمی احمد خاں (سر سیّد) انگریز سے کچھ فائدہ

حاصل کرنے کی خاطر ان کے محلوں کا طواف کرتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا اور اپنے مذہب کو چھوڑنے اور انگریزی مذہب اختیار کرنے کے لئے چند قدم آگے بڑھائے۔ اس نے اپنے کام کی ابتدا ایک تصنیف سے کی جس میں یہ ثابت کیا کہ توراتؔ اور انجیلؔ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس طرح اس نے انگریزوں کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنا چاہا۔ پھر انہیں اور خوش کرنے کے لئے اس نے صراحتاً نصرانی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس معمولی خدمت پر جو تصنیف کی صورت میں اس نے ادا کی ہے کوئی قابلِ قدر معاوضہ ملنے کی توقع بہت کم ہے کیونکہ ایسی کتابیں بہت سے پادری اور مستشرق اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور معدودے چند افراد کے سوا مسلمانوں کو دین سے ہٹانے میں ناکام رہے اس لئے اس نے اپنے انگریز حاکموں کی خوشنودی کی خاطر مسلمانوں کی آواز کمزور کرنے اور ان کے اتفاق کو برباد کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

چنانچہ وہ نیچریوں اور دہریوں کے رُوپ میں ظاہر ہو کر یہ ثابت کرنے لگا کہ دنیا میں اندھی فطرت اور نیچر کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں وہ اس کھُلی گمراہی کا اعلان کرنے لگا کہ اس دُنیا کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ اس کے خیال میں سارے انبیا دہری ہی تھے اور اس معبود کے بالکل قائل نہ تھے جس کا ذکر شرائع میں آیا ہے نعوذباللہ۔ اس نے اپنا لقب نیچری رکھ لیا۔ اس نے دولتمند طبقہ کے پُرجوش لیکن سادہ لوح نوجوانوں کو اُبھارنا شروع کیا اور بہت سے

نوجوان شریعت کی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کی تمنّا اور حیوانی شہوات سے لذّت اُٹھانے کے شوق میں اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انگریزی حکّام کو مسلمانوں کے دلوں میں فساد کا بیج بونے کے لئے یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ انہوں نے اس کی عزّت و تکریم شروع کردی اور علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کرنے میں اس کی مدد کی۔ جس کا نام محمڈن کالج رکھا گیا۔ یہ ایک جال تھا جو مسلمان بچّوں کو شکار کرکے "احمد خان بہادر" کے افکار کے مطابق پرورش کرنے کے لیے پھیلایا گیا۔

احمد خان نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے جس میں قرآنی الفاظ کے معانی میں تحریف کرکے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں صرف وہی مضامین شائع ہوئے جو مسلمانوں کی عقلوں کو گمراہ کرتے اور ان میں تفرّق اور دشمنی کے بیج بوتے تھے۔ اس رسالے کے مضامین کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کو دیگر ممالک اسلامیہ اور خصوصاً دولتِ عثمانیہ سے بدظن کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس نے تمام مذاہب کو چھوڑنے کا بلند آواز سے اعلان کردیا۔ وہ "نیچر نیچر" پکار کر لوگوں کو اس وسوسے میں ڈالنے لگا کہ یورپ کو تمدّن علم، صنعت و حرفت اور قوّت و اقتدار میں فوقیت صرف اس لئے حاصل ہوئی کہ انہوں نے مذہب کو خیرباد کہا اور صرف نیچر کو واضح کرنے کی طرف متوجّہ ہوئے جو اس کے خیال میں ہر مذہب کا اصلی مقصد ہے۔ حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے،

جس وقت ہم ہندوستان میں تھے اس وقت ہم نے یہ محسوس کیا کہ بعض کم عقل لوگ سید احمد خاں اور اس کے چیلوں کے ملمع بیانات سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اسوقت ایک رسالہ[1] لکھا جسمیں اس غلط مذہب اور اس کے خطرناک نتائج کو واضح کرنے کے بعد یہ ثابت کیا گیا تھا۔ کہ تہذیب و تمدن کی عمارت صرف مذہب کی بنیاد پر قائم ہے۔ ہمارا یہ رسالہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شائع ہوا تھا۔

احمد خاں اور اس کے پیروکاروں نے دین کا لباس خود اُتارا اور مسلمانوں میں فتنہ ڈالنے اور ان کی آواز کو کمزور کرنے کے لیے انہیں بھی دین کے چھوڑنے کی طرف دعوت دی۔ پھر ان کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں اور دیگر ممالک کے مسلمانوں میں مخالفت کا بیج بو رہے ہیں ہندوستان کے دہری یورپ کے دہریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یورپ کے دہریے مذہب چھوڑ کر بھی ملک اور وطن کی محبت میں سرشار ہیں اور اجنبی حملہ آوروں سے ملک کو بچانے، ملک کو ترقی دینے اور اس کو مخالفین کے دستبرد سے بچانے کی خاطر اپنے بیش قیمت مال و متاع اور اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ مگر احمد خاں اور اس کے ساتھی ایک طرف لوگوں کو دین کے چھوڑنے پر آمادہ کرتے ہیں اور دوسری طرف دینی اور نسلی حمیت کے آثار کو مٹانے اور اجنبی تسلط کا جواز پیدا کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں اور ان ملکی مصالح کی کھوج میں لگے

---

[1] اس رسالہ کا اردو ترجمہ اس ادارہ کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

رہتے ہیں - جو ابھی تک انگریزوں کے دستبرد سے بچے ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ انہیں بھی حکومت کے قبضے میں دے دیں یہ سب کچھ وہ کسی بڑے اجر کی خاطر نہیں کرتے اور اس میں ان کے مدّنظر کوئی عالی مرتبت شرف نہیں ہوتا صرف معمولی درجہ کی زندگی اور چند کوڑیوں کے فائدہ کے لئے یہ خدمات سرانجام دی جاتی ہیں -

انگریز نے احمد خان کے ساتھ احسان کیا اور اس کے لڑکے محمود کو ہندوستان کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں میونسپل کمشنر بنا دیا -

کمزور مسلمانوں کو پھانسنے کے لئے اس کے پاس ایک حربہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو یہ وعدے دلاتا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے تو ظالم انگریزوں کے ہاں اُسے جو رسائی اور اثر و رسوخ حاصل ہے اُسے استعمال کر کے وہ انہیں حکومت کے عہدوں میں حصہ دلا دے گا - مگر حکومتِ ہند نے اس کے ساتھیوں میں سے آج تک صرف چار شخصوں کو قصباتی میونسپل کمیٹیوں میں ممبری کے عہدے دیئے ہیں اس قسم کے اعمال اور عہدے ان کے سوا کسی اور ہندوستانی کو نہیں ملے اور یہی وہ بزرگی ہے جو احمد خان کو اپنے دین اور وطن بیچنے کے بدلے میں حاصل ہوئی بقول نواب صدیق حسن خان بھوپال، احمد خان آخری زمانے کا دجّال ہے -

بیشک حکومت نے اس کے پیش کردہ بعض اصحاب کو ملازمتیں دلانے میں امداد کی - مگر یہ ملازمتیں حکومت کی آسامیوں سے متعلق نہیں تھیں - اور نہ انگریزی حکومت کے خزانے پر ان کا بوجھ پڑا بلکہ ان چند نوابوں کی ریاستوں کی تھیں، جو

استقلال کے کسی نہ کسی درجہ میں اس وقت حکمرانی کر رہے ہیں۔ ان نوابوں اور والیان ریاست کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں بعض ادنیٰ قسم کی ملازمتیں دے دیں۔

یہ طریق انگریز حاکموں کو بڑا پسند آیا اور انہوں نے یہ سمجھ کر اس چیز کا خیر مقدم کیا کہ اس طرح وہ ہندوستان سے اسلام کو مٹا سکیں گے۔ یہ دہری ہندوستان میں انگریزی حکومت کے لئے فوج کا کام دینے لگے۔ وہ مسلمانوں ہی کی گردن کاٹنے کے لئے نیام سے تلوار نکالتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ روتے اور یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ ہم تو صرف اس لئے تمہیں قتل کرتے ہیں کہ ہمیں تمہارے ساتھ محبت اور دلی ہمدردی ہے ہم صرف تمہاری اصلاح کرنا اور تمہیں خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں اور انگریز کے خیال میں اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کے لئے یہ قریب ترین وسیلہ ہے۔

احمد خان کا شاگرد رشید اور اس کا پہلا مشیر ایک شخص ہے جس کا نام سمیع اللہ خان ہے۔

وہ دہریوں میں سب سے بڑا مکار اور سب سے بڑا حیلہ ساز ہے۔ اس کی چالیں بڑی گہری ہوتی ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان کے اتحاد و اتفاق کو ختم کرنے کے نت نئے راستے نکالنے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قدم مضبوط کرنے میں اس کا فریب بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہ مکار شخص مسلمانوں کی مجالس میں تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو بات کرنے سے پہلے اس کے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور اسلام کو مٹانے اور اس کے بنیادی قواعد کو باطل ثابت کرنے کے لئے

وہ انتہائی درجہ کی فصاحت استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور پیغمبروں پر اعتراضات کرتا اور پھر اس طرح زور زور سے روتا ہے گویا اسے دین اور دینداروں کا غم کھائے جا رہا ہے۔

اس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے جب وہ کسی قصبے یا شہر میں جاتا ہے تو پہلے چند دن مسجدوں میں جاتا اور دینی مجالس میں شامل ہونا شروع کرتا ہے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے لوگوں کو رام کر کے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پھر جب اس کی ظاہری شگفتگی اور خوش مزاجی پر فریفتہ ہو کر چند لوگ اس کے ساتھ مل جاتے ہیں تو ان کو بے دینی کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے اس کھلے دشمن نے اپنی ان خدمات کی بدولت انگریزی شریعت کے ایک قاضی کا عہدہ بلدیۂ آگرہ میں حاصل کیا حالانکہ وہ قصبہ آبادی میں "دسوق" سے بڑا نہیں ہو گا۔ ٹائمز نے سمیع اللہ خان کی ہر قسم کی ممکن تعریف کرنے کے بعد یہ لکھا کہ یہ سب سے بڑا عہدہ ہے جو کسی ہندوستانی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ کیا انگریز کی چالوں کو ثابت کرنے کے لئے اس سے بھی بڑی شہادت کی ضرورت ہے؟

لارڈ فارٹپردگ کے سوانح ہم نے گزشتہ اخبار میں لکھے ہیں اور ہندوستان میں اس کی تاریخ ناظرین کو اچھی طرح معلوم ہو گی۔ وہ سمیع اللہ خان کو اس وقت سے جانتا تھا۔ جب وہ ہندوستان میں سررشتہ دار تھا (حکمدار)۔ چنانچہ وہ اس بات

کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ سمیع اللہ خان انگریزوں کی خدمت سرانجام دینے کے لئے ایک نہایت عمدہ مہرہ ہے اس نے سمیع اللہ خان کو بلایا کہ وہ مصر میں اس کا پرائیویٹ سیکرٹری بنے اور دولتِ عثمانیہ سے مصریوں کو متنفر کرنے میں انگریزوں کا آلۂ کار بنے۔ مقصد یہ ہے کہ مصریوں کو یہ کہہ کر تسلی دی جائے کہ انگریز ان کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتے ہیں، دوسرے ان کا منشا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مصری اور ہندوستانی علماء کو بھی انگریزوں کی طرف مائل کردیں کیونکہ اس کے قول کے مطابق وہ بھی تو علماء کا ایک فرد اور رکن رکین ہے۔

شاید سمیع اللہ خان کا ارادہ یہ ہو کہ وہ مصر میں جامع مسجدوں میں داخل ہو کر وعظ اور لکچر دینا شروع کرے اور انگریزوں کے انصاف کی وہ بے سُود کہانیاں سنائے جو سراسر جھوٹی ہیں۔ مگر مصریوں کی ہشیاری، ان کے سچے مذہبی عقائد اور دولتِ عثمانیہ کے ساتھ ان کے مضبوط تعلقات سے نہیں یہ اُمید ہے کہ وہ اس مکّار کے فریب میں نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہر مقصد میں ناکام اور اپنی ہر تمنّا میں حیران ہی رکھے۔

5

/56

بیداری

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا۔

(اے ہمارے پروردگار آپ کی طرف سے ہم پر رحمت ہو اور آپ ہمارے اس کام کے لئے کامیابی کا سامان مہیا کریں۔)

گزشتہ ایام میں انگریزوں نے ہندوستان کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا تو ہندوستانیوں نے اپنے فرائض بجا لانے میں کوتاہی کی۔ ایک دوسرے سے روگردانی کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جس اتفاق اور اجتماع کی دعوت دی تھی اس سے غفلت برتی۔ چنانچہ اس جرم کی سزا ان کو بھگتنی پڑی وہ انگریزی اقتدار کے بوجھ سے دب گئے۔ انہوں نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا ہم ہندوستانیوں کے امانتدار اور خدمت گزار ہیں گرفتہ رفتہ یہ خدمتگزاری سرداری میں بدل گئی۔ ہندوستانی سرداروں کو اپنے آدمیوں کی خدمتگزاری اور نوکری پر مامور کیا گیا۔ مگر انگریزی سیادت انصاف اور عدل پر مبنی نہیں تھی۔ انہوں نے ہندوستانیوں پر حکمرانی کرنے میں عدل کی حدود سے تجاوز کیا اور ظلم وجور کے قوانین کے ساتھ جور و استبداد کی حکومت چلانے لگے۔ جس وقت ہندوستانیوں کو انگریزوں کے بپا کردہ فسادات کی آگ میں جھلسنا پڑا اس وقت انہیں ہوش آیا۔ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور ان ظالموں سے جان چھڑانے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ ان کی تحریک

آزادی کی ابتدا آج سے ۷۴ سال پیشتر ہوئی تھی مگر ان کے افغانی، بلوچی اور ایرانی بھائی ان کی تحریک سے غافل رہے اور ان کی طرف امداد کا ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ایرانی انگریزوں سے لڑ بھی رہے تھے، مگر ہندوستانیوں نے اس بارے میں ان تک رسائی کی کوشش نہیں کی اور اس جنگِ آزادی میں امداد دینے کے لئے نہ ایرانیوں کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا کیا اور نہ دولتِ عثمانیہ سے تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف ہم ہندوستان کے پڑوسیوں کو بھی اس کوتاہی سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے، کیونکہ پڑوسیوں کی بے پروائی نے اجنبی ظالموں کو غلبہ حاصل کرنے میں مدد دی ہے۔ حالانکہ یہ غافل پڑوسی سمجھدار ہوتے تو اندازہ لگا لیتے کہ دشمن کا ہندوستان میں تسلّط حاصل ہو گیا تو اس کی طاقت مضبوط ہو جائے گی اور وہ ان پر بھی وہی مصائب توڑے گا جو ان کے بھائیوں پر توڑے جا رہے ہیں۔

ہندوستان میں قبضہ جما لینے کے بعد دشمن نے بلوچستان کا رُخ کیا اور انہیں چیلنج پر چیلنج دینا شروع کیا۔ افغانیوں اور ایرانیوں نے ان کی امداد میں کوتاہی کی۔ اور دشمن نے بلوچستان کے ایک بڑے قطعہ پر مکمّل قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد افغانستان کا رُخ کیا۔ چنانچہ افغانیوں اور انگریزوں کے درمیان ایک خوفناک لڑائی ہوئی جو تقریباً دو سال تک جاری رہی۔ اس عرصے میں نہ ہندوستانیوں کی رگِ حمیّت پھڑکی، نہ ایرانیوں کی طرف سے کسی نے امداد کے لئے بازو پھیلایا اور نہ عثمانیوں

اور افغانیوں کے درمیان کوئی اتحاد کا سامان مہیّا ہوا - اگر ان سب کو عاقبت اور انجام کے متعلق بصیرت ہوتی تو ان کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ ہر ایک کی زندگی دوسروں کی زندگی سے وابستہ ہے ۔

دشمن نے اپنی دست اندازیاں برابر جاری رکھیں - یہاں تک کہ اس نے دولتِ عثمانیہ کی طرف بھی ظلم کا ہاتھ بڑھایا اور دولتِ عثمانیہ کے سب سے بڑے صوبے بلکہ مسلمانوں کے سب سے اہم مُلک مصر پر لشکر کشی کی - آج وُہ اس ملک پر قبضہ کر کے اور دولتِ عثمانیہ کے حقوق کا خیال رکھے بغیر اپنی استبدادی حکومت چلانے کی فکر میں ہے -

جس طرح مسلمانوں نے دوسرے مقامات پر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے میں کوتاہی کی - اسی طرح یہاں بھی وُہ اسلامی ممالک پر نازل ہونے والے مصائب سے قطعاً بے پروا اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ دشمن اپنے وعدوں پر قائم رہے گا - مگر جب انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنی گمراہی میں مستغرق اپنی رفتار میں تیز، اپنی طاقت پر مغرور اپنے جال کو پھیلائے ہوئے بڑھتا ہی چلا آ رہا ہے تو ان کا جمود ختم ہوا - پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے اور ثوابت ستاروں کی طرح ٹھہرے ہوئے افراد بھی حرکت میں آئے اور جو کوتاہیاں ان سے پہلے سرزد ہوئی تھیں اس پر نادم ہوئے اور ان کو یہ احساس ہوا کہ آج جو کچھ بعض ملکوں کو پیش آیا ہے وہی کل خود ان کو پیش آ سکتا ہے - ہمیں ایران - ہندوستان اور افغانستان سے جو خطوط موصول

ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مصری مسئلہ مذہبی اخوت کو دوبارہ زندہ کرنے کا ذریعہ بن چکا ہے۔ اگر انگریز نے اپنے لالچ کو اسی رفتار سے جاری رکھا اور جوع الارض نے اُسے ترکوں کے حقوق غصب کرنے پر آمادہ کیا اور دولتِ ترکیہ اس کی مدافعت پر استقلال کے ساتھ ڈٹی رہی، ایسے مسلمانوں کی تعداد کافی مل جائے گی، جو ترکیہ کی امداد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور انگریز سے پُورا پُورا بدلہ لیں گے۔

ان مومنوں کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی مذہبی غیرت کا اظہار کیا ہے ہم ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ شریعت حقہ کی آواز پر جمع رہیں اور ان بھوتوں کی آوازوں کی طرف توجہ نہ دیں جو انسانوں کی سی آواز بنا کر تاریک راتوں میں پکارتے رہتے ہیں۔ یہ آوازیں دراصل سرکش روحوں کی آوازیں ہیں جو مسلمانوں کے اتحاد کو بگاڑنا اور اجتماعی قوت کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اتحاد کے اصول پر ثابت قدم رکھے اور ان کے درمیان الفت کی بنیاد مضبوطی سے قائم کردے، تاکہ ان کی خواہشات انہیں اس بات پر آمادہ نہ کریں کہ وہ ثانوی مسائل کو بہانہ بنا کر اسلامی اتحاد کی اس عمارت کو گرادیں، جس کے ارکان اللہ۔ اس کے ملائکہ۔ اس کی کتابوں اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا یہ اختلاف دشمن کو یہ موقعہ دے کہ وہ ہماری ملت کو مٹادے اور ہمارے مقبوضات کو ختم کرلے۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی سَوَآءِ السَّبِیْلِ (اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے)۔

کہاوت

پُرانی کہاوتوں میں ایک قصّہ مشہور ہے کہ شہر اصطخر سے باہر ایک بڑا طلسم خانہ تھا۔ بعض وقت جب راہ چلتے مسافروں کو رات کا اندھیرا گھیر لیتا تو وہاں جاکر پناہ لینے کی کوشش کرتے۔ مگر جب بھی کوئی مسافر وہاں گیا موت کا شکار ہوا۔ صبح کو روشنی میں جب اس کی تلاش میں لوگ نکلتے اور چلتے چلتے اس طلسم خانہ کو بھی دیکھتے تو اُسے وہاں مُردہ پاتے۔ یہ پتہ کبھی نہ چلا کہ موت کا سبب کیا تھا۔ بہ ظاہر مردے کے بدن پر کبھی ضرب یا چوٹ وغیرہ کی کوئی علامت نہیں دیکھی جاتی۔ طلسم خانے کا یہ معاملہ قافلوں میں اور شہریوں میں یکساں طور پر بہت مشہور ہوا اور ہر شخص وہاں رات گذارنے سے بچنے لگا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے زندگی سے اُکتا کر موت کو ترجیح دینا پسند کیا وہ اپنے ہاتھوں خودکشی تو کر نہیں سکتا تھا۔ اس لئے وہ طلسم خانہ میں اس امید پر گیا کہ شاید وہیں موت آجائے۔ طلسم خانہ کے پاس کچھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے اسے بڑی نصیحت کی اور موت سے ڈرایا مگر اُس نے اُن کی ایک نہ سنی۔ اُس نے کہا "موت کی تلاش میں ہی تو میں یہاں آیا ہوں"۔

جس وقت وہ طلسم خانہ کے عین وسط میں پہنچا تو یکایک بڑی زوردار ڈراؤنی

آوازیں آنے لگیں۔ اُسے یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک بڑی بھیڑ اس کے سامنے کھڑی شور مچا رہی ہے اور اُس سے کہہ رہی ہے کہ ہم تمہیں ختم کرنے کے لئے آئے ہیں۔ دیکھو ہم ابھی تمہاری جان نکال لیں گے، دیکھو ابھی تمہارے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے اور تمہاری ہڈیوں کو پیس دیا جائیگا۔ اس نے زور کا نعرہ لگا کر کہا کہ پھر اسی لئے تو زندگی سے اُکتا کر میں تمہارے پاس آیا ہوں آؤ اور میرا کام تمام کر دو

ابھی اس کی بات پوری ہونے بھی نہ پائی تھی کہ تڑاک تڑاک کی آوازیں آئیں، طلسم ٹوٹ گیا۔ دیوار پھٹ گئی۔ اس سے کچھ روپے اور اشرفیاں گرنے لگیں۔ اور خزانوں کے دروازے کھل گئے۔ وہ آدمی یہ دیکھ کر حیران بھی ہوا اور اس کے دل کو آرام بھی پہنچا۔ آخر وہیں سو گیا۔ صبح کو جب خوب روشنی ہوئی تو جن لوگوں نے اُس کو رات اندر جانے سے روکا تھا وہ اس کا جنازہ لے جانے کے خیال سے پہنچے مگر انہوں نے دیکھا کہ وہ خوشی خوشی بیٹھا ہوا ان سے سونا اور چاندی لے جانے کے لئے برتن مانگ رہا ہے۔ جب اُس نے ان کو اپنا قصہ سنایا تو سب کہنے لگے کہ آج تک جتنے لوگ بھی مرے ہیں وہ صرف ان ڈراؤنی آوازوں کی ہیبت سے مرے ہیں۔

برطانیہ عظمٰے بھی اسی طرح ایک طلسم خانہ ہے۔ جس وقت سیاست کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں تو بعض غریب خوردہ لوگ اس کی پناہ لینے کے لئے قریب آ جاتے

ہیں اور پھر بھیانک وہموں کی وجہ سے ان کو موت آجاتی ہے - بہت سے
کمزور اور بے دل مسافر اس طلسم خانہ کی دیواروں میں پھنس کر ہلاک ہوئے - مگر
مجھے اندیشہ ہے کہ کسی دن کوئی شخص ایسا بھی نکل آئے گا- جس کے دل میں مایوسی
نے شجاعت پیدا کی ہو اور زندگی سے تنگ آگیا ہو - اس وقت اس کی نا اُمیدی
کا ایک ہی نعرہ لگانے کی دیر ہو گی - پھر یہ دیوار خود بخود پھٹ جائے گی اور یہ
بڑا طلسم خود بخود ٹوٹ جائے گا-

عروۃ الوثقیٰ

پالیسی عروۃ الوثقیٰ کے مقالات اور تذکرات اہلِ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کے حالات پر اثر انداز ہونے والے واقعات اور کیفیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر وہ کسی مشرقی مسئلہ کو زیادہ بسط اور اطناب سے پیش کرنے لگے، یا امریکہ اور جاپان کی بعض خبروں کو پیش کرنے میں تساہل کرے تو اس پر گرفت نہیں کرنا چاہیے۔

ہم نے اس جریدہ کے پہلے شمارے میں یہ بات واضح کی تھی کہ اس کا اہتمام کرنے والے مشرق کے کچھ غیرت مند اصحاب ہیں جنہوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ اپنے وطن اور مذہب کے لئے کچھ مفید کام کریں گے اور اپنے کاموں میں انصاف اور حکمت و تدبیر کی رعایت کے ساتھ ترقی کا قدم اُٹھائیں گے۔ جو شخص اس کی صفت تقسیم سے یہ سمجھنے لگا ہو کہ یہ کسی خاص سلطنت یا امارت اور بادشاہی کے کسی خاص اُمیدوار کی حمایت کے خیال سے جاری کیا گیا ہے تو اس کو یہ غلط فہمی صرف اس لئے ہوئی کہ خود اس کے نفس میں نا اُمیدی نے گھر کر لیا ہے اور وہ مایوسی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اتنے حقیر سے کام کے لئے آمادۂ عمل ہونے کے لئے بھی کچھ باہمت مسلمان نہیں مل سکتے۔ حالانکہ اتنی مایوسی مسلمانوں کی شان نہیں ہے

يقنط من روح الله الا القوم الكافرون[1]

اس جریدہ میں گالی گلوچ اور لعن طعن کی گنجائش نہیں۔ اس میں کسی شخص کے نام یا لقب کا ذکر صرف اس وقت آئے گا۔ جب اس کے کسی قول یا عمل کو زیر بحث لانے میں عمومی مصلحت ہو۔

حکومتِ مصر

مصری وزراء کے کابینہ کا اجلاس قاہرہ میں منعقد ہوا اور اس نے عروۃ الوثقیٰ کے بارے میں خاص طور پر غور و خوض کیا۔ اس کے بعد مصر کی ہوم منسٹری کے نام یہ تجویز بھیج دی کہ عروۃ الوثقیٰ کا داخلہ مصر میں بند کر دے اور اس کی اشاعت پر خاص نگرانی رکھے۔ چنانچہ ہوم منسٹری نے محکمہ ڈاک کو سخت ہدایات بھیج دیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ گزٹ میں ان احکام کے شائع ہونے کے بعد یہ اعلان بھی شائع ہوا کہ جس کے پاس عروۃ الوثقیٰ کا پرچہ ملے گا اس پر ۵ سے لے کر ۲۵ گنی تک کا جرمانہ کیا جائیگا۔ (شاید ان دنوں انگریزی تصرف کی وجہ سے مصری مالیات کو مشکلات درپیش ہیں جن کی وجہ سے اتنے بڑے جرمانہ مقرر کرنے کی ضرورت پیش آئی)

بہر حال ہمارا خیال یہ ہے کہ اس تجویز کے متعلق مصری کابینہ کا کوئی رُکن بھی اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے میں آزاد نہ تھا۔ ہمارے خیال میں تو خدیو مصر کا جذبہ بھی اس قسم کے حکم صادر کرنے کا میلان نہ رکھتا ہوگا۔ ہم تو یہ سمجھتے

---

[1] اور اللہ کے فیض سے کافر ہی نا اُمید ہوتے ہیں۔

ہیں کہ ہر مصری مسلم ہو یا غیر مُسلم بلکہ مشرق کا ہر باشندہ اس حکم کو ظلم پر مبنی سمجھے گا۔ یہ جریدہ مصریوں کی مدافعت کرنے اور ان کو مدد پہنچانے کے خیال سے جاری کیا گیا ہے۔ وُہ مصر کے دشمنوں کی مساعی کو ناکام بنانے میں پوری کوشش کر رہا ہے اس کا مقصد زید کی مدح یا عمرو کی قدح کرنے سے زیادہ اعلیٰ ہے۔ اس کا کام تو صرف یہ ہے کہ حسد اور کینوں کی بھڑکتی ہوئی آگ پر نصیحت کا چھڑکاؤ کر کے اسے ٹھنڈا کرے اور سارے اہل مشرق کو اتحاد اور محبت پر آمادہ کرے۔ یہ جریدہ مشرقی ممالک کے باشندوں سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وُہ آپس کے جھگڑوں کو چھوڑ دیں اور اپنی تلواریں ان درندوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سنبھال لیں جو اس وقت انہیں لقمہ اجل بنانے کے لئے مُنہ کھولے ہوئے ہیں۔ اس اخبار کی رائے یہ ہے کہ گھریلو جھگڑوں میں انسان کو اس وقت پڑنا چاہیئے جب لٹیروں کی ڈاکہ زنی کا خطرہ ٹل جائے۔ عروۃ الوثقیٰ کی یہ پالیسی ہر اُس شخص کو معلوم ہے جو اس کا باقاعدہ مطالعہ کرتا رہا ہو۔ کیا کوئی سمجھدار یہ کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کے اخبار کا داخلہ مشرق کا کوئی مُسلم یا غیر مُسلم باشندہ اپنے ملک میں بند کر سکتا ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ آج کل مصر میں اربابِ اقتدار کے تمام اعمال و احکام ان کے اختیار سے بالکل خارج اور جبری ہیں اور جبر کی اس چکّی کے چلانے والے انگریز ہیں۔

ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ کچھ لوگ اس اخبار کا مقابلہ کرنے کی تیّاریاں کر رہے ہیں اور وُہ اس کی تعریف کا بدلہ مذمت سے، احسان کا بدلہ بُرائی سے اور خیر خواہی

کا بدگمانی سے دینا چاہتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ یہ کام نہ تو قصداً کر رہے ہیں اور نہ کسی دشمن کے بھڑکانے پر۔ صرف کسی شبہ نے ان کی نظروں سے حقیقت کو اوجھل کر دیا ہے جس وقت زمانہ ان کو واقعات سمجھا دے گا وہ خود اپنے کئے پر پشیمان ہوں گے۔ اور حق کی طرف دوبارہ آئیں گے۔

ہمسائے ہمارا یہ اخبار کبھی کبھی مسلمانوں کا ذکر خصوصیت سے کرتا ہے اور صرف ان کے حقوق کی طرف سے مدافعت کرتا ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اخبار کا مقصد مسلمانوں کے درمیان اور ان کے وطنی پڑوسیوں کے درمیان اختلاف کا بیج بونا ہے۔ یہ لوگ ان کے ساتھ ملکی مصالح میں مشترک ہیں اور ان کے منافع میں مدتوں سے باہمی شرکت چلی آ رہی ہے۔ ہمارا مقصد ان کو لڑانا نہیں۔ نہ ہمارے جذبات اس قسم کے ہیں اور نہ ہمارا مذہب ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ شریعت اس کو روا رکھتی ہے۔ ہمارا مقصد تو مشرق کے عام باشندوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اجنبیوں کی دست درازی سے ڈرانا ہے کبھی کبھی ہم خالص مسلمانوں کو اس لئے مخاطب کرتے ہیں کہ جہاں اجنبیوں نے خیانت شروع کی ہے اور وہاں کے باشندوں کو ذلیل کیا ہے وہاں کے محاصل پر قبضہ کیا ہے وہاں کے اکثر باشندے مسلمان ہیں۔

ہندوستانی اخبارات ہمارے پاس کچھ ہندوستانی اخبارات پہنچتے ہیں اور ہم نے خدمتِ وطن کے بارے میں ان کی معتدل رفتار دیکھ

کر بڑی خوشی محسوس کی ہے ہمیں اس سے زیادہ خوشی یہ ہے کہ اہلِ مشرق اور مسلمانوں سے متعلق ہمارے جو مقالے شائع ہوئے ہیں انہیں عربی سے اردو ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ ہم خصوصیّت سے اخبار" دار السلطنت" کلکتہ اور "مشیر قیصر" لکھنؤ کے بہت شکر گزار ہیں۔ ان اخبارات کی مذہبی اور وطنی غیرت سے ہمیں یہی توقع تھی۔

ہندوستان کے مسلمان جو ایک صدی سے انگریزوں کے غلام ہیں۔ ان کا یہ رویہ تو یہ ہے۔ مگر یہ سن کر ہمیں بڑا افسوس ہوا کہ بعض مصری اصحاب کے نام جب اخبار بھیجا جاتا ہے تو وہ ڈر کے مارے اُسے وصول کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں حالانکہ ان اوقات میں مصریوں سے بڑے بڑے اقدامات کی توقع تھی کہ ان کی آزادی کی اُمیدیں اور وسائل زیادہ قریب ہیں

فرنگی اخبارات اگر ہم نے پکار کر آوازیں دیں کہ اے غافلو بیدار ہو جاؤ۔ اے نیند کے متوالو آنکھیں کھولو، اے اپنی قسمت پر ناز کرنے والو، آرزوؤں کی دنیا میں بسنے والو! یا خیالی جنّتیں بنانے والو ذرا ہوشیار ہو جاؤ یا اگر ہم مصر والوں کو یہ کہہ کر ڈرائیں کہ جونہی انگریز کے قدم اس ملک میں جم گئے وہ لوگوں کے دل و دماغ، خیالات اور ارادوں کی قوتوں کا محاسبہ کریگا تو لوگ کہیں گے کہ ہم خوف دلانے اور ڈرانے میں مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انگریز بیٹے سے باپ کا اور پوت سے دادا کا بدلہ لیا کرتے ہیں اور وہ اس اولاد سے اسلاف کے خزانوں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کو علم بھی نہیں کہ ان کے اسلاف نے کچھ چھوڑا بھی تھا یا نہیں تو لوگ سمجھیں گے کہ ہم بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ انگریزوں کے سینے میں ہر

عام و خاص ایرانی کے خلاف حسد کی آگ جل رہی ہے۔ انہیں ہندوستان میں بھی جہاں کہیں ایرانی ملے ان سے وہ بدمعاملگی سے پیش آتے ہیں اور ان سے بڑی نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایرانی بادشاہ نادر شاہ نے مغلوں کے زمانے میں دہلی کے خزانوں پر قبضہ کر کے ایران پہنچا دیا تھا۔ اب یہ لوگ غصہ سے انگلیاں کاٹتے رہے ہیں اور نادر شاہ نے دہلی کے مال پر قبضہ کر کے انہیں جو اس سے محروم کر رکھا ہے اس پر انہیں افسوس آتا ہے اور اپنے خیال میں وہ ہر ایرانی باشندے کو اس گناہ کا مرتکب ٹھہراتے ہیں تو لوگ ہمیں مبالغہ پرداز کہیں گے اگر ہم ان کو انگریزوں کے وہ کارنامے سنائیں جو وہ ہندوستانیوں کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً عمل میں لاتے ہیں اور یہ بتائیں کہ انگریزوں کے نزدیک کسی مسلمان عالم کو جزائر انڈیمان بھیجنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ قرآن کی آیت کو ماننے کا اقرار کرلے تو بہت سے لوگ جو ان ممالک سے دور اور وہاں کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں ہماری باتوں کو باور نہیں کریں گے۔ مگر اس وقت ہمارا یہ مقصد بھی نہیں کہ انگریزی سلطنت کے متعلق جو کچھ حالات ہم جانتے ہیں ان کو دلائل کے ساتھ بیان کر کے مصریوں کو قائل کردیں۔ ہم اس وقت نہ نصیحت کرنا چاہتے ہیں اور نہ حکایات اور قصے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ صرف ان کے سامنے معاملہ کے متعلق ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ شاید وہ صاحب بصیرت اصحاب کے لئے آئینہ بن کر ان کے سامنے انگریزی تسلط کے پوشیدہ حالات سامنے لائے۔

ہم نے اپنا یہ اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا تو بعض فرانسیسی اخبارات کے مدیروں نے اس کے متعلق اپنے اخبارات میں (اس کے مسلک اور طریق کار کی وضاحت کئے بغیر) صرف اطلاع شائع کردی۔ جب اہم انگریزی اخبارات تک یہ اطلاع پہنچی تو ان کے مدیروں کی رگِ حمیّت بُری طرح بھڑک اُٹھی۔ انہوں نے انگریزی سیاست پہ ہمارے اخبار کے اثر انداز ہونے اور مشرقی ممالک میں اس کی مقبولیت کے بارے میں اپنی حکومت کو خطرے سے آگاہ کیا۔ حکومت کو ہمارے اخبار کے خلاف بھڑکانے میں انہوں نے بڑی کوشش کی اور اس پر زور دیا کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اس اخبار کا داخلہ مصر اور ہندوستان میں بند کرادے بلکہ یہ مشورہ بھی دیا گیا کہ ترکی حکومت کو اس اخبار پر پابندی لگانے کے لئے مجبور کیا جائے اور یہ سب کچھ اس وقت کیا گیا جب کہ ابھی ہمارے اخبار کا پہلا شمارہ بھی شائع نہیں ہوا تھا اور ابھی ان میں سے کسی کو بھی اس کے سیاسی موقّف کا علم نہ تھا۔ حالانکہ ہمارا اخبار نہ تو جذبات کے بھڑکانے کے لئے جاری ہوا ہے اور نہ فتنوں کو برانگیختہ کرنے کے لئے۔ اس کا مقصد تو اہلِ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کرنا، ان کے بعض غافل افراد کو بیدار کرنا اور انہیں اپنی بھلائی کی طرف متوجہ کرنا ہے اور جیسا کہ اس کے ہر ایک پڑھنے والے کو معلوم ہے کہ یہ اخبار اعتدال کے مسلک پر چلتا اور استقامت اور انصاف کا طریقہ پیش کرتا ہے۔ جرم کے صدور سے پہلے قصاص لینے پر آمادگی اور شور و شر ایک

عجیب سی منطق ہے۔ بہر حال ہم انگریزی حکومت پر یہ اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ جان لے کہ ہم مشرقی ممالک میں اپنے افکار پھیلانے سے عاجز نہیں۔ اس اخبار کے ذریعہ سے ممکن نہ ہوا تو دوسرے ذرائع سے یہ کام انجام دیا جائے گا کیونکہ سچائی کے مددگار کافی ہیں ؛